جلد ۵ عدد ۱
رجب ۱۳۵۳ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم (۲۹۵۰)

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ) بیرون ہند کے لئے (ہے) قیمت فی پرچہ (مر)

الجہاد فی الاسلام

ضخامت ... صفحات

قیمت بلا جلد للعہ انگریزی

تالیف

ابو الاعلیٰ مودودی

قیمت سکہ عثمانیہ مجلد ۵ انگریزی

ہندیہ و بیجارہ آنہ

کتاب کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے اس کے صرف ایک باب (باب ہفتم) کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو:-

جنگ اور تہذیب جدید

ماخذ کی تحقیق - بین الملّی قانون (International Law) کی حقیقت - بین الملّی قانون کے ماخذ - بین الملّی قانون کا شعبۂ جنگ - مغربی جنگ کا اصلی قانون - ضروریاتِ جنگ - قوانین جنگ کی ناپائداری - فوجی اور قانونی گروہوں کا اختلاف -

مقصد جنگ جنگ عظیم کے اسباب و وجوہ - دول کی جتھہ بندیاں - شرکائے جنگ کے پوشیدہ مقاصد - اعلان جنگ - خفیہ معاہدے - جنگ کے بعد قوموں اور ملکوں کی تقسیم - مغرب کی حق پرستی کا معیار - قیام امن اور نزع سلاح کی تحریکیں - جمعیت اقوام - تحریم جنگ اور نزع سلاح کی جدید تجاویز -

قوانین جنگ مغربی قوانین جنگ کی تاریخ - ہیگ کے سمجھوتے اور انکی قانونی حیثیت - اعلان جنگ - اہل قتال (Combatants) اور غیر اہل قتال کا امتیاز - وجوہ امتیاز - امتیاز کا احساس کب پیدا ہوا - دور جدید کی جنگ میں امتیاز ناممکن ہے - اہل قتال کے حقوق و فرائض :- قواعد حرب کی پابندی، امان، اسیران جنگ، مجروحین و مرضیٰ و مقتولین، تباہ کن اشیاء کا استعمال، جاسوس، عہد شکنی، خدع فی الحرب، انتقام - غیر اہل قتال کے حقوق و فرائض :- غیر مقاتلین کا اولین فرض، غیر مقاتلین کی عصمت - غیر محفوظ آبادیوں پر گولہ باری - عنوۃً فتح ہونیوالے شہروں کا حکم - احتلال (Occupation) اور اس کے قوانین - غارت گری اور تباہ کاری - غیر جانبداروں کے حقوق و فرائض - غیر جانبداری کی تاریخ، دور جدید میں غیر جانبداروں کی حیثیت، محاربین (Belligerents) کے فرائض غیر جانبداروں کے متعلق، غیر جانبداروں کے فرائض محاربین کے متعلق - آخری تبصرہ - مغربی قانون کے مقابلہ میں اسلامی قانون کی وجوہ ترجیح -

دفتر "ترجمان القرآن" سے طلب فرمائیے

فہرست مضامین

ماہ رجب ۱۳۵۳ھ جلد ۵ عدد ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ماہ گزشتہ کے اشارات میں ان اثرات پر ایک مجموعی تبصرہ کیا گیا تھا جو دنیا کے مسلمانوں پر مغربی تہذیب کے استیلاء اور مغربی قوموں کے علمی اور سیاسی اقتدار سے رونما ہوئے ہیں، اس وقت ہمارے پیش نظر کسی خاص اسلامی جماعت کے حالات نہ تھے، بلکہ وہ حالات تھے جو تمام مسلمان قوموں میں عام ہیں۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی استثنائی حالت اس عمومی نظر کے علاوہ ایک خصوصی نظر بھی چاہتی ہے۔ اس لیے آج ہم خصوصیت کے ساتھ ان اثرات پر تبصرہ کرنا چاہتے ہیں جو انگریزی علوم اور انگریزی تمدن و تہذیب کے غلبہ سے اسلامی ہند کی فکری اور عملی دنیا میں ظاہر ہوئے ہیں۔

دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ان ممالک پر مشتمل ہے جو صدر اول کے مجاہدین کی کوششوں سے فتح ہوئے ہیں۔ ان کو جن لوگوں نے فتح کیا تھا وہ ملک گیری اور حصول غنائم کے لیے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ کو دنیا میں بلند کرنے کے لیے سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے، وہ طلب دنیا کے بجائے طلب آخرت کے نشہ میں سرشار تھے، اس لیے انھوں نے اپنے مفتوحین کو مطیع و باجگزار بنانے پر اکتفا نہ کیا بلکہ انہیں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا، ان کی پوری آبادی یا اس کے سواد اعظم کو ملت حنیفی میں جذب کر لیا، اور علم و عمل کی قوت سے ان میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کو اس قدر راسخ کر دیا کہ وہ خود تہذیب اسلامی کے علم بردار اور علوم اسلامی کے معلم بن گئے۔ ان کے بعد وہ ممالک ہیں جو اگرچہ صدر اول کے بعد اس عہد میں فتح ہوئے جبکہ اسلامی جوش سرد ہو چکا تھا اور فاتحین کے دلوں میں خالص جہاد فی سبیل اللہ کی روح سے زیادہ ملک گیری کی ہوس نے جگہ لے لی تھی، لیکن اس کے باوجود اسلام وہاں پھیلنے اور جڑ پکڑ لینے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے

ان ممالک میں کلیتہً ایک قومی مذہب اور قومی تہذیب کی حیثیت حاصل کرلی۔

بدقسمتی سے ہندوستان کا معاملہ ان دونوں قسم کے ممالک سے مختلف ہے۔ صدر اول میں اس ملک کا بہت تھوڑا حصہ فتح ہوا تھا اور اس تھوڑے سے حصہ پر بھی جو کچھ اسلامی تعلیم و تہذیب کے اثرات پڑے تھے ان کو باطنیت کے سیلاب نے ملیا میٹ کردیا۔ اس کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات کا اصلی سلسلہ شروع ہوا، تو فاتحوں میں صدر اول کے سے مسلمانوں کی خصوصیات باقی نہیں رہی تھیں۔ انھوں نے یہاں اشاعت اسلام کے بجائے توسیع مملکت میں اپنی قوتیں صرف کیں، اور لوگوں سے اطاعت خدا و رسول کے بجائے اپنی اطاعت اور باج گزاری کا مطالبہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدیوں کی فرمانروائی کے بعد بھی ہندوستان کا سواد اعظم غیر مسلم رہا، یہاں کے اسلامی تہذیب جڑ نہ پکڑ سکی، یہاں کے باشندوں میں سے جنھوں نے اسلام قبول کیا ان کی اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی خاص انتظام نہ کیا گیا، نو مسلم جماعتوں میں قدیم ہندوانہ خیالات اور رسم و رواج کم و بیش باقی رہے، اور خود باہر سے آئے ہوئے قدیم الاسلام مسلمان بھی اہل ہند کے میل جول سے مشرکانہ طریقوں کے ساتھ رواداری برتنے، اور بہت سی جاہلانہ رسوم کا اتباع کرنے لگے۔

اسلامی ہند کی تاریخ اور اس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جس زمانہ میں اس ملک پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار پوری قوت سے چھایا ہوا تھا اس زمانہ میں بھی یہاں اسلام کے اثرات کمزور تھے، اور یہاں کا ماحول خالص اسلامی ماحول نہ تھا۔ اگرچہ ہندوؤں کا مذہب اور تمدن بالذات ضعیف تھا، اور ایک محکوم و مغلوب قوم کا مذہب و تمدن ہونے کی حیثیت سے اور بھی زیادہ ضعیف ہوگیا تھا، لیکن پھر بھی مسلمان حکمرانوں کی رواداری اور غفلت کی بدولت وہ ملک کے سواد اعظم پر چھایا ہوا رہا اور ہندوستان کی فضا پر اس کے مستولی ہونے اور خود مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت مکمل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں کے مسلمانوں کا ایک بڑا حصہ اپنے عقائد اور اپنی تہذیب میں کبھی اتنا صحیح و پختہ اور کامل مسلمان نہ ہوسکا جتنا وہ خالص اسلامی ماحول میں ہوسکتا تھا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں وہ سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں سے چھین گیا جو ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے بڑا اسہارا تھا۔ پہلے مسلمانوں کی سلطنت متفرق ہو کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوئی۔ پھر مرہٹوں اور سکھوں اور انگریزوں کے سیلاب نے ایک ایک کر کے ان ریاستوں میں سے بیشتر کا خاتمہ کر دیا، اس کے بعد تقضائے الٰہی نے انگریزوں کے حق میں اس ملک کی حکومت کا فیصلہ صادر کیا، اور ایک صدی سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ مسلمان اس سرزمین میں مغلوب و محکوم ہو گئے جس پر انھوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔ انگریزی سلطنت جتنی جتنی پھیلتی گئی مسلمانوں سے ان طاقتوں کو چھینتی چلی گئی جن کے بل پر ہندوستان میں اسلامی تہذیب کسی حد تک قائم تھی۔ اس نے فارسی اور عربی کے بجائے انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا، اسلامی قوانین کو منسوخ کیا، شرعی عدالتیں توڑ دیں، دیوانی اور فوجداری معاملات میں خود اپنے قوانین جاری کیے، اسلامی قانون کے نفاذ کو خود مسلمانوں کے حق میں صرف نکاح و طلاق وغیرہ تک محدود کر دیا، اور اس محدود نفاذ کے اختیارات بھی مسلمان قاضیوں کے بجائے عام دیوانی عدالتوں کے سپرد کر دیے جن کے حکام عموماً غیر مسلم ہوتے ہیں اور جن کے ہاتھوں "محمڈن لا"، روز بروز مسخ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ انگریزی حکومت کی ابتدا سے یہ پالیسی رہی کہ مسلمانوں کو معاشی حیثیت سے پامال کر کے ان کے اس قومی فخر و ناز کو کچل ڈالے جو ایک حاکم قوم کی حیثیت سے صدیوں تک ان کے دلوں میں پرورش پاتا رہا ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر اندر اس پالیسی کی بدولت یہ قوم مفلس، جاہل، پست خیال، فاسد الاخلاق، اور ذلیل و خوار ہو گئی۔

اس گرتی ہوئی قوم پر آخری ضرب وہ تھی جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں لگی۔ اس نے مسلمانوں کی صرف سیاسی قوت ہی کا خاتمہ نہیں کیا، بلکہ ان کی ہمتوں کو توڑ دیا، ان کے دلوں پر مایوسی اور احساس ذلت کی تاریک گھٹائیں مسلط کر دیں، ان کو انگریزی اقتدار سے اتنا مرعوب کیا کہ ان میں قومی خودداری کا شائبہ تک باقی نہ رہا، اور ذلت و خواری کی انتہائی گہرائیوں میں پہنچ کر وہ ایسا سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ دنیا میں سلامتی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریزی اطاعت، عزت حاصل کرنے کا ذریعہ انگریز کی خدمت، اور ترقی کرنے کا ذریعہ انگریز کی تقلید کے سوا اور کوئی نہیں ہے، اور ان کا اپنا سرمایۂ علم و تہذیب جو کچھ بھی ہے ذلیل، سبب ذلت اور موجب نکبت ہے۔

انیسویں صدی کے نصفِ دوم میں جب مسلمانوں نے سنبھل کر پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو وہ دو قسم کی کمزوریوں میں مبتلا تھے:-

ایک یہ کہ وہ فکر و عمل کے اعتبار سے پہلے ہی اسلامی عقائد اور تہذیب میں پختہ نہ تھے، اور ایک غیر اسلامی ماحول اپنے جاہلی افکار اور تمدن کے ساتھ ان کو گھیرے ہوئے تھا۔

دوسرے یہ کہ غلامی اپنے تمام معائب کے ساتھ نہ صرف ان کے جسم پر بلکہ ان کے قالب و روح پر بھی مسلط ہو چکی تھی، اور وہ ان تمام قوتوں سے محروم کر دیئے گئے تھے جن سے کوئی قوم اپنے تمدن و تہذیب کو برقرار رکھ سکتی ہے۔

اس دوہری کمزوری کی حالت میں مسلمانوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو انہیں نظر آیا کہ انگریزی سلطنت نے اپنی ہوشیاری سے معاشی ترقی کے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں، اور اسکی کنجی انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں رکھ دی ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کرتے، چنانچہ مرحوم سید احمد خان کی رہنمائی میں ایک زبردست تحریک اُٹھی جس کے اثر سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا، پرانے لوگوں کی مخالفت بے کار ثابت ہوئی، دولت، عزت، اور اثر کے لحاظ سے قوم کی اصلی طاقت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی انھوں نے اس نئی تحریک کا ساتھ دیا، ہندوستان کے مسلمان تیزی کے ساتھ انگریزی تعلیم کی طرف بڑھے، قوم کا تلچھٹ پرانے مذہبی مدرسوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تاکہ مسجدوں کی امامت اور مکتبوں کی معلمی کے کام آئے، اور خوشحال طبقوں کے بہترین نونہال انگریزی مدرسوں اور کالجوں میں بھیج دیئے گئے تاکہ ان کے دل و دماغ کے سادہ اوراق پر فرنگی علوم و فنون کے نقوش ثبت کیے جائیں۔

یہ انیسویں صدی کی آخری چوتھائی کا زمانہ تھا۔ یورپ میں اس وقت مادیت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ اٹھارہویں صدی میں سائنس پوری طرح مذہب کو شکست دے چکا تھا۔ جدید فلسفہ اور نئے علوم حکمت کی رہنمائی

میں سیاسیات، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے پرانے نظریے باطل ہو کر نئے نظریے قائم ہو چکے تھے، اور یورپ میں ایک نئی تہذیب پیدا ہو چکی تھی جس کی بنیا وکلیتہً انہی جدید نظریوں پر قائم تھی۔ اس انقلاب عظیم نے زندگی کے عملی معاملات سے تو مذہب اور ان اصولوں کو جو مذہبی رہنمائی پر مبنی تھے کلی طور پر خارج ہی کر دیا تھا۔ البتہ تخیل کی دنیا میں مذہبی اعتقاد کی تھوڑی سی جگہ باقی رہ گئی تھی، سو اب اس کے خلاف زبردست جنگ جاری تھی۔ اگرچہ علوم حکمت میں سے کسی علم نے بھی کائنات کے الٰہی نظریہ کے خلاف کوئی شہادت (جس کو ثبوت کہا جا سکتا ہو) بہم نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اہل حکمت بغیر کسی دلیل کے اپنے طبعی رجحان کی بنا پر خدا سے بیزار اور الٰہی نظریہ کے دشمن تھے، اور چونکہ انہی کو اس وقت دنیا کی عقلی و علمی امامت کا منصب حاصل تھا، اس لیے ان کے اثر سے خدا سے بیزاری (Theophobia) کا مرض ایک عام وبا کی طرح پھیل گیا تھا۔ وجود باری کا انکار، کائنات کو آپ سے آپ پیدا ہونے والی اور آپ سے آپ قوانین طبیعی کے تحت چلنے والی چیز سمجھنا، خدا پرستی کو توہم (Superstition) قرار دینا، مذہب کو لغو اور مذہبیت کو تنگ نظری و تاریک خیالی کہنا، اور نیچریت (Naturalism) کو روشن خیالی کا ہم معنی سمجھنا اس وقت فیشن میں داخل ہو چکا تھا، اور ہر شخص خواہ وہ فلسفہ وسائنس میں کچھ بھی دستگاہ نہ رکھتا ہو، اور اس نے خود ان مسائل کی تحقیق میں ذرہ برابر بھی کوشش نہ کی ہو صرف اس بنا پر ان خیالات کا اظہار کرتا تھا کہ سوسائٹی میں وہ ایک روشن خیال آدمی سمجھا جائے۔ روحانیات (Spritualism) یا فوق الطبیعیت (Supernaturalism) کی تائید میں کچھ کہنا اس وقت کفر کا درجہ رکھتا تھا۔ اگر کوئی بڑے سے بڑا سائنس داں بھی اس قسم کے کسی خیال کا اظہار کرتا تو سائنٹفک حلقوں میں اس کی ساری وقعت جاتی رہتی، اس کے تمام کارناموں پر پانی پھر جاتا، اور وہ اس قابل نہ رہتا کہ اسے کسی علمی جماعت کی رکنیت کا شرف بخشا جائے۔

۱۸۵۹ء میں ڈارون کی کتاب اصل الانواع (Origin of species) شائع ہوئی جس نے نیچریت اور دہریت کی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اگرچہ ڈارون کے دلائل جو اس نے اپنے مخصوص نظریہ ارتقاء کی تائید میں

پیش کیے تھے، کمزور اور محتاجِ ثبوت تھے، اور اس کے سلسلۂ ارتقاء میں ایک کڑی نہیں بلکہ ہر موجود کڑی کے آگے اور پیچھے بہت سی کڑیاں مفقود تھیں، اور اہلِ حکمت اس وقت بھی اس نظریہ سے مطمئن نہ تھے، حتیٰ کہ خود اس کا سب سے بڑا مبلغ ہکسلے Huxley بھی اس پر ایمان نہ لایا تھا، مگر اس کے باوجود محض خدا سے بیزاری کی بنا پر ڈارونیت کو قبول کر لیا گیا، اس کی حد سے زیادہ تشہیر کی گئی، اور مذہب کے خلاف ایک زبردست آلہ کے طور پر اسے استعمال کیا گیا، کیونکہ اس نظریہ نے اہلِ حکمت کے زعمِ باطل میں اس دعوے کا ثبوت فراہم کیا تھا (حالانکہ دراصل ایک اور دعویٰ کیا تھا جو محتاجِ ثبوت تھا) کہ کائنات کا نظام کسی فوق الطبیعی قوت کے بغیر خود بخود طبیعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اہلِ مذہب نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور برٹش ایسوسی ایشن کے جلسہ میں بشپ آف آکسفورڈ اور گلیڈ اسٹن نے اپنی خطابت کا پورا زور اس کے خلاف صرف کیا، مگر شکست کھائی، اور آخرکار اہلِ مذہب تک دہریت سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ ۱۸۸۲ء میں جب ڈارون نے وفات پائی تو چرچ آف انگلینڈ نے وہ سب سے بڑا اعزاز اسکو بخشا جو اس کے اختیار میں تھا، یعنی اسے ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کرنے کی اجازت دی، حالانکہ وہ یورپ میں مذہب کی قبر کھودنے والوں کا سرخیل تھا اور اس نے افکار کو الحاد و زندقہ اور بے دینی کی طرف چلانے اور وہ ذہنیت پیدا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا جس نے آخرکار بولشوزم کو پھلنے پھولنے اور بار آور ہونے کا موقع دیا۔

یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے، اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب، فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ انکی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور انکی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آب و ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تأمل آمنّا و صدّقنا کہیں، اور قرآن و حدیث یا ائمۂ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول

اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے۔ اور مغرب میں مذہب کا یہ تصور ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور یہاں اللہ کا وجود ہی مسلّم نہیں۔ اسلام کا سارا نظام شریعت وحی و رسالت کے اعتقاد پر قائم ہے اور یہاں وحی کی حقیقت ہی میں شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ وہاں حیات اخروی کا اعتقاد پورے اسلامی اخلاقیات کا سنگ بنیاد ہے، اور یہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ وہاں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں، یہاں وہ محض عہد جاہلیت کے رسوم ہیں جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصول تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے، رسول خدا شارح قانون، اور انسان صرف متبع قانون۔ مگر یہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں، لیجسلیچر واضع قانون ہے، اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی۔ اسلام کا رخ (Internationalism) بین الملیت کی طرف ہے اور مغرب کا کعبۂ مقصود وطنیت اور Nationalism ہے۔ معاشیات میں اسلام اکل حلال اور زکوٰۃ و صدقہ پر زور دیتا ہے، اور مغرب کا سارا نظام معاشی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدود زن و مرد، تعدد ازدواج، قوانین نکاح و طلاق، ضبط ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں، اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی، اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہ ہو سکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور درستی کا معیار سمجھ لیا۔ پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا۔ اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام ہی کو برسر غلط سمجھا، اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہونچایا ہو، مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدے سے نہیں ہو سکتی۔

مقالات

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی

(۱۷)

ایمان

۵- ایمان بالیوم الآخر

اعتقاد یوم آخر کی ضرورت اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن، اور اغلب، اور اقتضائے حکمت کے مطابق ہے، اور عقل (بشرطیکہ صحیح و سلیم ہو) اور علم (بشرطیکہ حقیقی ہو) ہم کو اخروی زندگی کے اس تصور پر جو قرآن نے پیش کیا ہے، ایمان لانے سے روکتے نہیں بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ اخروی زندگی کے اس تصور پر ایمان لانے کی ضرورت کیا ہے؟ اس کو ایمانیات میں کیوں داخل کیا گیا ہے؟ اس پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ مسلمان ہونے کے لیے اس کو ماننا لازم ہو اور کوئی شخص اسکو تسلیم کیے بغیر مسلمان نہ ہوسکتا ہو؟ اسکو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس کا انکار کرنے کے بعد خدا اور رسول اور کتاب پر ایمان لانا بھی نافع نہ ہو، حتی کہ زندگی بھر کے نیک اعمال بھی غارت ہوجائیں؟ ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اخروی زندگی کا نظریہ بھی ویسا ہی ایک مابعد الطبیعی نظریہ ہے، جیسے مابعد الطبیعیات کے دوسرے نظریات ہیں۔ ہم نے مانا کہ یہ نظریہ دلیل وحجت سے خوب مستحکم کردیا گیا ہے، اور اس کو تسلیم کرنے کے لیے کافی وجوہ موجود ہیں۔ لیکن مابعد الطبیعیات کے کسی مسئلہ کا دلیل سے ثابت ہوجانا یہ معنی تو نہیں رکھتا کہ اس پر ایمان لانا ضروری ہوجائے اور اسی پر کفر و اسلام کا

مدار ٹھیرے۔ حیات اخروی کی طرح مابعد الطبیعیات کے اور بھی بہت سے نظریات ایسے ہیں جن کی تائید میں قوی دلائل موجود ہیں۔ پھر ان سب کو بھی اسی طرح داخل ایمان کیوں نہ کر لیا گیا ؟

اگر حیات اخروی کے اعتقاد کی حیثیت محض ایک مابعد الطبیعی مسئلہ کی ہوتی، تو یہ اعتراض یقیناً قوی ہوتا۔ اس صورت میں اس مسئلہ کو ایمانیات میں داخل کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی، کیونکہ کسی خالص مابعد الطبیعی مسئلہ کا اس حیثیت سے کہ وہ مابعد الطبیعی مسئلہ ہے، ہماری عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ہم اس سے خالی الذہن ہوں، یا اس کو ماننے سے انکار ہی کر دیں تو ہمارے اخلاق اور اعمال پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن حیات اخروی کے مسئلہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا ایک گہرا تعلق ہے۔ اسکے ماننے اور نہ ماننے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جوابدہ ہستی سمجھے، اور اپنی زندگی کے تمام معاملات یہ سمجھتے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لیے ذمہ دار ہے، آیندہ زندگی میں اسکو اپنے تمام اعمال کا جواب دہی کرنی ہے، اور مستقبل کی سعادت و شقاوت، اس کے اعمال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے۔ بخلاف اسکے اس اعتقاد کو تسلیم نہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر مسئول ہستی سمجھے اور اپنی دنیوی زندگی کا سارا پروگرام اس خیال کے تحت مرتب کرے کہ وہ اس زندگی کے اعمال کیلیے کسی دوسری زندگی میں جوابدہ نہیں ہے اور آیندہ کوئی اچھا یا برا نتیجہ اس زندگی کے اعمال و افعال پر مترتب ہونے والا نہیں ہے۔ اس عقیدہ سے خالی الذہن ہونے یا اسکو نہ ماننے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ انسان کی نظر اپنے اعمال کے صرف ان نتائج پر ہوگی جو اس دنیوی زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، اور انہی نتائج کے لحاظ سے وہ رائے قائم کرے گا کہ کون سا فعل اس کے لیے مفید ہے اور کون سا مضر۔ وہ زہر کھانے اور آگ میں ہاتھ ڈالنے سے ضرور احتراز کرے گا، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ان دونوں حرکتوں کے برے نتائج اپنی اسی زندگی میں بھگت لے گا۔ لیکن ظلم، بے انصافی، جھوٹ، غیبت، خیانت، زنا اور ایسے ہی دوسرے افعال کے پورے نتائج چونکہ اسی دنیوی زندگی میں ظاہر نہیں ہوتے، اس لیے وہ ان سے صرف اسی حد تک اجتناب کرے گا جس حد تک ان کا کوئی برا نتیجہ

اس زندگی میں مترتب ہونے کا اندیشہ ہو، اور جہاں کوئی برا نتیجہ مترتب ہوتا نظر نہ آئے، یا بعکس اس کے ان سے کوئی فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو تو وہ ان افعال کے ارتکاب میں کوئی تامل نہ کرے گا۔ غرض یہ کہ اس تصور کے ماتحت اسکی نگاہ میں کسی اخلاقی فعل کی کوئی متعین اخلاقی قدر نہ ہوگی۔ بلکہ ہر ایسے فعل کی اچھائی اور برائی اس نتیجہ کی اچھائی اور برائی پر منحصر ہوگی جو اس پر اس دنیا میں مترتب ہوتا ہو۔ بخلاف اس کے جو شخص یوم آخر کا معتقد ہوگا اسکی نظر اپنے اخلاقی افعال کے صرف انہی نتائج پر نہ ہوگی جو اس زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، بلکہ وہ اُن آخری نتائج پر نگاہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں اور ان نتائج کے لحاظ سے ہر فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کریگا اسکو جس طرح زہر کے ہلاک اور آگ کے موذی ہونے کا یقین ہوگا اسی طرح خیانت اور جھوٹ کے مہلک اور موذی ہونے کا بھی یقین ہوگا، وہ جس طرح روٹی اور پانی کو مفید سمجھیگا اسی طرح عدل اور امانت کو بھی مفید سمجھیگا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متعین اور یقینی نتیجہ کا قائل ہوگا خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں قطعاً ظاہر نہ ہو، بلکہ بعکس صورت میں ظاہر ہو۔ اس کے پاس تمام اخلاقی افعال کی متعین اخلاقی قدریں ہونگی، اور ان قدروں میں دنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔ اس کے نظام اخلاق میں صداقت، انصاف، اور وفائے عہد بہرحال صواب اور حسن ہی ہونگے، خواہ اس دنیا میں ان سے سراسر نقصان ہی نقصان ہو اور قطعاً کوئی فائدہ نہ ہو، اور جھوٹ ظلم اور بدعہدی بہرحال گناہ اور بدی ہی ہونگے خواہ ان سے دنیا میں سراسر فائدہ ہی فائدہ ہو اور ذرہ برابر کوئی نقصان نہ ہو۔

پس حیات اخروی کے اعتقاد سے خالی الذہن ہونے یا اس کا انکار کر دینے کے معنی بس اسی قدر نہیں ہیں کہ انسان ایک مابعد الطبیعی نظریہ سے خالی الذہن رہا یا اس نے اس نظریہ کو ماننے سے انکار کر دیا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنی ذمہ دارانہ اور مسئولانہ حیثیت سے غافل ہو گیا، اپنے آپ کو مطلق العنان اور جوابدہی سے بری الذمہ سمجھ بیٹھا، دنیا اور اسکی ظاہری زندگی اور اس کے غیر مکمل بلکہ بسا اوقات دھوکا دینے والے نتائج سے مطمئن ہو گیا، اس نے آخری منافع اور آخری نقصانات سے غافل ہو کر محض ابتدائی اور عارضی اور ناقابل اعتبار منفعتوں اور مضرتوں کا اعتبار کر لیا اور انہی کے لحاظ سے اپنے افعال کی ایسی اخلاقی قدریں متعین کیں جو بدلنے والی اور دھوکہ دینے والی ہیں۔ وہ ایک صحیح اور پائیدار اخلاقی ضابطہ سے محروم ہو گیا جو صرف ذمہ داری کے احساس اور آخری نتائج کے ملاحظہ اور

متعین اخلاقی قدروں کے اعتبار ہی سے منضبط ہو سکتا ہے، اور اس طرح اس نے اپنی پوری زندگی دنیا کے ناقص سطحی مظاہر سے دھوکا کھا کر ایک ایسے ناپائیدار اور غلط اخلاقی ضابطہ کے تحت بسر کی جس میں حقیقی مضرت، منفعت بن گئی، اور حقیقی منفعت، مضرت قرار پائی، حقیقی حسن، قبیح بن گیا اور حقیقی قبیح حسن قرار پایا، حقیقی گناہ، صواب بن گیا، اور حقیقی صواب، گناہ قرار پایا۔

یوم آخر پر ایمان نہ لانے کے یہی نتائج ہیں جن کو قرآن مجید میں بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں آیات قرآنی کا تتبع کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ تمام خرابیاں ایک ایک کر کے گنائی گئی ہیں جو یوم آخر کو نہ ماننے سے انسان کے اخلاق اور اعمال میں پیدا ہو جاتی ہیں۔

(۱) انسان اپنے آپ کو مہمل، مطلق العنان، غیر ذمہ دار سمجھتا ہے، اپنی زندگی کو بحیثیت مجموعی بے نتیجہ خیال کرتا ہے، اور یہ سمجھ کر کام کرتا ہے کہ کوئی اس کے کام کا نگراں اور اس سے حساب لینے والا نہیں ہے:-

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (۲۳ : ۶)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو عبث پیدا کیا ہے اور تم ہمارے پاس واپس نہ لائے جاؤ گے؟
أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (۷۵ : ۲)	کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟
أَيَحْسَبُ أَن لَّن يَقْدِرَ عَلَيْهِ أَحَدٌ يَقُولُ أَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا أَيَحْسَبُ أَن لَّمْ يَرَهُ أَحَدٌ (۹۰)	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اس پر کسی کا بس نہ چلے گا؟ وہ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال اڑا دیا، کیا وہ سمجھتا ہے کہ کسی نے اسکو نہیں دیکھا؟

(۲) ایسے آدمی کی نظر دنیا کے صرف ظاہری پہلو پر ہوتی ہے۔ ابتدائی اور سطحی نتائج کو وہ آخری اور حقیقی نتائج سمجھتا ہے، اور ان سے دھوکہ کھا کر غلط رائے قائم کرتا ہے۔

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (۳۰ : ۱)	وہ صرف ظاہر حیات دنیا کو دیکھتے ہیں اور آخرت سے تو وہ غافل ہی ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَاءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (۱:۱۰)

جو لوگ ہم سے ملنے کی امید نہیں رکھتے اور حیات دنیا سے راضی اور مطمئن ہوگئے ہیں۔

کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (۱:۷۵)

ہرگز نہیں ؟ تم تو فوری حاصل ہونے والے نتائج کو پسند کرتے ہو اور آخرۃ کے نتائج کو چھوڑ دیتے ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (۸۷)

تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا (۶:۷)

ان کو حیات دنیا نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔

(۳) اس ظاہر بینی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی نگاہ میں اشیاء کی اخلاقی قدروں کا معیار بالکل الٹا ہوجاتا ہے۔ جو چیزیں حقیقت میں اپنے آخری نتائج کے لحاظ سے مضر ہوتی ہیں ان کو وہ فوری فوائد پر نظر رکھنے کی وجہ سے مفید سمجھتا ہے، اور جو اعمال آخری نتائج کے لحاظ سے غلط ہیں ان کو وہ ابتدائی نتائج کا لحاظ کرکے خیر و صلاح سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی دنیوی کوششیں صحیح راہوں سے بھٹک جاتی ہیں اور آخر کار ضائع ہوجاتی ہیں۔

قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا (۸:۲۸)

جو لوگ دنیوی زندگی ہی کے فائدوں کو چاہتے تھے انہوں نے کہا کہ کاش ہم کو بھی وہی ملتا جو قارون کو دیا گیا ہے۔ وہ بڑا ہی خوش نصیب ہے اور جن لوگوں کو علم دیا گیا تھا انہوں نے کہا کہ تم پر افسوس! اللہ کا ثواب اس شخص کیلیے بہت اچھا ہے جو ایمان لایا اور جس نے نیک اعمال کیے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ زَیَّنَّا لَهُمْ اَعْمَالَهُمْ فَهُمْ یَعْمَهُوْنَ (۱:۲۷)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کیلیے ہم ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیتے ہیں اور وہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔

اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّهُمْ بِهٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ

کیا یہ لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہم جو ان کو

نُسَارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْرَاتِ بَل لَّا يَشْعُرُونَ (۲۳: ۴) مال اور اولاد سے مدد دیتے ہیں تو گویا ان کے لیے خیرات میں جلدی کرتے ہیں؟ مگر یہ لوگ حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۔ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ (۱۸: ۱۲) کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ٹوٹے میں کون لوگ ہیں؟ وہ جن کی کوششیں حیات دنیا میں بھٹک گئیں مگر وہ سمجھتے رہے کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، اس لیے ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔

(۴) ایسا شخص کبھی دین حق کو قبول نہیں کر سکتا۔ جب کبھی اس کے سامنے مکارم اخلاق اور اعمال صالحہ اور راست روی کے طریقے پیش کئے جائیں گے، وہ ان کو رد کر دیگا، اور جب ان کے خلاف عقائد اور اعمال پیش کیے جائیں گے تو وہ انہیں اختیار کرے گا۔ کیونکہ دین داری کے جتنے طریقے ہیں وہ دنیوی زندگی کے بہت سے فوائد و منافع اور بہت سی لذتوں کی قربانیاں چاہتے ہیں، اور ان کا اصل الاصول یہ ہے کہ آخرت کے بہتر اور پائندہ تر فوائد کے لیے دنیا کے عارضی فوائد کو قربان کرو۔ مگر منکر آخرت اسی دنیا کے فوائد کو فوائد سمجھتا ہے، اس لیے وہ نہ ایسی کسی قربانی کے لیے طیار ہو سکتا ہے اور نہ دین داری کے ان طریقوں کو اختیار کر سکتا ہے جو ان قربانیوں کے طالب ہیں۔ لہٰذا انکار آخرت اور دین حق کی پیروی دونوں ایک دوسرے کے نقیض ہیں۔ جو منکر آخرت ہوگا وہ کبھی دین حق کا پیرو نہیں ہو سکتا۔

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِن يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں حق کے بغیر تکبر کرتے ہیں۔ وہ اگر کسی آیت کو دیکھیں گے تو اس پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر راہ راست کو دیکھیں گے تو اسے اختیار نہ کریں گے اور اگر غلط راستے کو دیکھیں گے تو اس پر چل پڑیں گے۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو

وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَاۗءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔ (۷ : ۱۴۷)

جھٹلایا اور ان سے غافل رہے اور جو لوگ ہماری نشانیوں اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلائیں گے انکے اعمال غارت ہوجائیں گے کیا ان کو ویسا ہی بدلہ نہ ملیگا جیسے انھوں نے عمل کیے ہیں ؟

(۵) انکار آخرت سے انسان کی پوری اخلاقی اور عملی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ وہ متکبر اور سرکش ہوجاتا ہے۔

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۔ (۱۶ : ۲۲)

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل حق بات سے انکار کرنے لگتے ہیں اور وہ متکبر ہوجاتے ہیں۔

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ (۲۸ : ۳۹)

فرعون اور اس کے لشکروں نے زمین میں بغیر کسی حق کے تکبر کیا اور سمجھنے لگے کہ وہ ہمارے پاس واپس لائے جائنگے

اس کے معاملات بگڑ جاتے ہیں :-

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ اَلَا يَظُنُّ اُولٰۗىِٕكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ (۸۳)

تباہی ہے ان بدمعاملہ لوگوں کے لیے جو دوسروں سے لیتے ہیں تو پورا پورا ناپ تول کر لیتے ہیں اور جب دوسروں کو ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم دیتے ہیں کیا وہ نہیں سمجھتے کہ وہ ایک بڑے دن کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

وہ سنگدل، تنگ نظر، ریاکار، خودغرض، اور عبادت الٰہی سے روگرداں ہوجاتا ہے :-

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰي طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۔ (۱۰۷)

کیا تونے دیکھا اس شخص کو جو روز جزا کی تکذیب کرتا ہے؟ یہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں ابھارتا۔ پھر افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نمازوں سے غفلت کرتے ہیں جو عمل نیک کرتے بھی ہیں تو دکھانے کے لیے اور جو چھوٹی چھوٹی معمولی ضرورت کی چیزیں بھی لوگوں کو دینے میں دریغ کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ حق سے تجاوز کرنا اور گناہوں میں مبتلا ہوجانا انکار آخرت کا لازمی نتیجہ ہے :۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۸۳)　　یوم الجزا کی تکذیب نہیں کرتا مگر ہر وہ شخص جو حق سے تجاوز کر گیا اور گناہوں میں پھنس گیا

یوم آخر کے اعتقاد سے خالی الذہن یا منکر ہونے کے یہ ایسے نتائج ہیں جن سے کوئی صاحب عقل انکار نہیں کر سکتا خصوصاً جبکہ ہم اپنی آنکھوں سے اُس تمدن کے ثمرات بھی دیکھ چکے ہیں جو ظاہر حیات، دنیا پر فریفتہ ہوکر زندگی کے محض دنیوی اور مادی مطمح نظر پر قائم ہوا ہے، اور حیات اخروی کے عقیدے سے یکسر خالی ہے، تو ہمارے لیے اس حقیقت سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ انکار آخرت کے ساتھ خدا پرستی، دین داری اور مکارم اخلاق کا قیام بالکل ناممکن ہے۔

اب دیکھیے کہ اسلام جب انہی چیزوں کو قائم کرنا چاہتا ہے، جب وہ انسان کو اخلاق فاضلہ اور اعمال صالحہ کی طرف دعوت دیتا ہے جن کے لیے دنیا کے بہت سی مادی منفعتوں اور لذتوں کی قربانی ضروری ہے، جب وہ انسان کو عبادت الٰہی اور تزکیۂ نفس کی تلقین کرتا ہے جس کا کوئی فائدہ اس دنیا میں مترتب ہوتا نظر نہیں آتا، بلکہ اس کے برعکس بہت سی تکلیفوں اور مشقتوں میں انسان کے نفس اور جسم کو مبتلا ہونا پڑتا ہے، جب وہ زندگی کے تمام معاملات اور دنیا کے اسباب و وسائل سے متمتع ہونے میں حرام و حلال اور خبیث و طیب کا امتیاز قائم کرتا ہے، جب وہ بالاتر روحانی مقاصد کے لیے انسان سے شخصی اغراض، شخصی محبتوں اور رغبتوں، اور بسا اوقات جان و مال تک کو قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے، اور جب وہ انسان کی زندگی کو ایک ایسے اخلاقی ضابطے کے تحت منضبط کرنا چاہتا ہے جس میں دنیوی فائدے اور نقصان سے قطع نظر کرکے ہر شے کی ایک خاص اخلاقی قدر متعین کر دی گئی ہے تو کیا وہ ایسے دین اور ایسی شریعت کو قائم کرنے میں عقیدۂ حیات اخروی کے بغیر کامیاب ہوسکتا تھا؟ کیا یہ ممکن تھا کہ انسان اس عقیدہ سے خالی الذہن یا منکر ہوتے ہوئے ایسی تعلیم کو قبول کر لیتا؟ اگر جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے نظام دینی اور ضابطۂ اخلاق کو قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے انسان کے دل میں حیات اخروی کے عقیدہ کو راسخ کر دیا جائے۔ پس یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر اسلام نے اس عقیدہ کو ایمانیات میں داخل کیا ہے اور اس پر اتنا زور دیا ہے کہ ایمان باللہ کے بعد اور کسی چیز پر اتنا زور نہیں دیا۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ اسلام نے اس عقیدہ کو کس شکل میں پیش کیا ہے اور اس سے انسان کے اخلاق و اعمال پر کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں۔

دنیا پر آخرت کی ترجیح سب سے پہلی چیز جس کو قرآن مجید نے انسان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا انسان کے لیے ایک عارضی جائے قیام ہے۔ اُس کے لیے صرف یہی ایک زندگی نہیں ہے بلکہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی اس سے بہتر اور پائندہ تر بھی ہے جس کے فوائد یہاں کے فائدوں سے زیادہ فراواں اور جس کے نقصانات یہاں کے نقصانات سے زیادہ سخت ہیں۔ جو شخص اس دنیا کے مظاہر سے دھوکہ کھا کر اسی کی لذتوں اور منفعتوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے، اور ان کو حاصل کرنے کے لیے ایسی کوششیں کرتا ہے جن کی بدولت اس دوسری زندگی کی لذتیں اور منفعتیں سے حاصل نہیں ہو سکتیں وہ بہت برا سودا کرتا ہے اور حقیقت میں اسکی یہ تجارت سراسر نقصان کی تجارت ہے۔ اسی طرح جو شخص اس دنیا کے نقصانات ہی کو نقصان سمجھتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے ایسی سعی کرتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو اس دوسری زندگی کے نقصان کا مستحق بنا لیتا ہے، وہ بہت بڑی حماقت کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا یہ فعل کسی طرح مقتضائے دانشمندی نہیں ہے۔ اس مضمون کو قرآن مجید میں اس کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ تمام آیات کا استقصار یہاں ممکن نہیں ہے۔ مثال کے طور پر آیات ذیل ملاحظہ ہوں:۔

مَا هٰذِهِ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ وَّاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹:۷)	یہ دنیا کچھ نہیں ہے مگر لہو و لعب۔ اور اصلی زندگی کا گھر آخرت ہی ہے۔
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى (۴:۱۱)	کہو اے محمد کہ متاع دنیا تھوڑی سی ہے، اور آخرت اس کے لیے بہتر ہے جو پرہیزگاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔
اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (۹:۶)	کیا تم آخرت کے عوض دنیا کی زندگی سے راضی ہو گئے؟ دنیا کی زندگی کے سامان تو آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑے ہیں۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (۸۷)

تم حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت زیادہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ (۳:۱۹)

ہر شخص کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم کو اپنی اس زندگی کے پورے پورے بدلے قیامت کے دن ملنے والے ہیں۔ پس اس روز جو شخص آگ کے عذاب سے بچ گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہی اصل میں کامیاب ہوا۔ رہی اس دنیا کی زندگی تو یہ محض دھوکے کا سامان ہے۔

وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (۱۱:۱۰)

جن لوگوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے وہ انہی لذتوں کے پیچھے پڑے رہے جو ان کو دی گئی تھیں اور وہ مجرم ہوئے۔

قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۲:۳۹)

اے محمد! کہہ دو کہ سخت نقصان میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے بال بچوں کو قیامت کے دن نقصان میں ڈالا۔ یہی اصلی اور کھلا ہوا ٹوٹا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (۷۹:۲)

پھر جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تو جہنم اس کا ٹھکانا ہے اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو خواہشات سے روکا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَا

جان لو کہ حیات دنیا تو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس میں کھیل اور کود اور زینت اور آپس کا تفاخر اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانا ہے۔ اسکی مثال بارش کی سی ہے کہ اس سے کھیتی لہلہاتی ہے اور کسان اسکو دیکھ کر

شَدِيدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۔ (۵۷ : ۳)

خوشیاں مناتے ہیں پھر وہ پک کر خشک ہو جاتی ہے اور تو دیکھتا ہے کہ وہ زرد پڑ گئی اور آخر کار روند ڈالی گئی - اس کے بعد آخرت کی زندگی ہے جس میں کسی کے لیے سخت عذاب ہے اور کسی کے لیے اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی ہے۔ پس دنیا کی زندگی محض ایک دھوکے کا سامان ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَاٰبِ قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خٰلِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ۔ (۲ : ۳)

لوگوں کے لیے عورتوں اور بچوں اور سونے چاندی کے ڈھیروں اور نشان لگے ہوئے گھوڑوں اور جانوروں اور کھیتوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے۔ یہ دنیوی زندگی کی متاع ہے مگر اللہ کے پاس اس سے اچھا ٹھکانا ہے۔ کہہ اے محمد کیا میں تمہیں اس سے بہتر متاع کی خبر دوں؟ جن لوگوں نے پرہیزگاری اختیار کی ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کو پاکیزہ ازواج ملیں گی اور وہ اللہ کی خوشنودی سے سرفراز ہونگے۔

دنیا پر آخرت کی ترجیح اور آخرت کی دائمی کامیابی کے لیے دنیا کے عارضی منافع کو قربان کرنے، اور آخرت کی ابدی نامرادی سے بچنے کے لیے دنیا کے چند روزہ نقصانات کو برداشت کرنے کی یہ تعلیم نہایت پرزور اور موثر انداز سے اسلام میں دی گئی ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ جو شخص قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہے وہ کسی تشدد اور زبردستی سے نہیں بلکہ اپنی دلی رغبت سے ہر وہ کام کرے جس کو کتاب اور رسول نے آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بتایا ہے، اور ہر اس چیز سے اجتناب کرے جس کو ان دونوں نے آخرت کے نقصانات کا سبب قرار دیا ہے، خواہ دنیا میں اس کے لیے کتنا ہی مفید یا مضر ہو۔

نامۂ اعمال اور عدالت دوسری بات جس کو قرآن مجید نے انسان کے دل میں بٹھانے کی کوشش کی ہے، یہ ہے کہ انسان اپنی دنیوی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے خواہ کتنا ہی چھپا کر کرے اس کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ محفوظ رہتا ہے، قیامت کے روز یہی ریکارڈ خدا کی عدالت میں پیش ہوگا، ہر ہر ذرہ جس کو انسان کے افعال سے کسی نوع کا تعلق رہا ہے، اس کے ان افعال پر گواہی دیگا، حتیٰ کہ خود اس کے اپنے اعضا بھی اس کے خلاف گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہونگے، پھر اس کے نامۂ اعمال کا نہایت صحیح وزن کیا جائے گا، میزان عدل کے ایک پلڑے میں اسکے نیک اعمال ہونگے اور دوسرے میں برے اعمال۔ اگر نیکی کا پلڑا جھک گیا تو آخرت کی کامیابیاں اس کا خیر مقدم کریں گی اور جنت اس کے لئے جائے قیام ہوگی۔ اور بدی کا پلڑا بھاری رہا تو خسران مبین اس کا نتیجہ ہوگا اور وہ بدترین مقام اس کے لیے تجویز کیا جائے گا جس کا نام دوزخ ہے۔ اس عدالت میں ہر شخص تنہا اپنے نامۂ اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا اور دنیوی اسباب میں سے کوئی چیز اس کے کام آئے گی۔ نہ نسبی اعزاز، نہ سعی و سفارش، نہ مال و دولت، اور نہ قوت و طاقت۔

اس مضمون کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ اور بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند آیات یہاں پیش کی جاتی ہیں:

نامۂ اعمال کی کیفیت:-

سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَن جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ لَهُ مُعَقِّبَاتٌ مِّن بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ (۱۳ : ۲)

تم میں سے جو شخص چھپا کر بات کرتا ہے اور جو زور سے بولتا ہے اور جو شخص رات کی تاریکی میں چھپا ہوا ہے اور جو دن کی روشنی میں چل رہا ہے، دونوں یکساں ہیں، بہرحال ہر ایک کے آگے اور پیچھے نگرانی کرنے والے لگے ہوئے ہیں اور وہ خدا کے حکم سے اسکی ہر بات ثبت کر رہے ہیں۔

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا

نامۂ اعمال پیش ہوگا تو اس میں جو کچھ لکھا ہوگا، تم دیکھو گے کہ مجرم اس سے ڈر رہے ہونگے اور کہہ رہے ہونگے کہ ہائے افسوس! اس کتاب کا

يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا۔ (۱۸: ۹)

کیا حال ہے کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بات نہیں چھوڑی سب اس میں موجود ہے جو کچھ انھوں نے عمل کیے تھے ان سب کو وہ حاضر پائیں گے۔

اعضاء کی گواہی اور انسان کا اعتراف :۔

يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲۴: ۳)

وہ دن جبکہ ان پر خود انکی زبانیں اور ان کے اپنے ہاتھ پاؤں ان اعمال کی گواہی دیں گے جو انھوں نے کیئے تھے۔

حَتَّىٰ إِذَا مَا جَاءُوهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَأَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ وَقَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ .... وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَنْ يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِنْ ظَنَنْتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِمَّا تَعْمَلُونَ۔ (۴۱: ۳)

یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو ان پر ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان اعمال کی گواہی دیں گی جو وہ کرتے تھے۔ وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی وہ جواب دیں گی کہ ہم [illegible] گویائی بخشی ہے جس نے ہر شے کو گویا کر دیا .... تم چھپا کر کام کرتے تھے اور نہ جانتے تھے کہ تمہارے اعمال پر خود تمہارے کان اور آنکھیں اور کھالیں گواہی دیں گی۔ بلکہ تم سمجھتے تھے کہ تمہارے بہت سے اعمال سے اللہ ناواقف ہے۔

وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ (۶: ۱۶)

وہ خود اپنے خلاف شہادت دیں گے کہ وہ ناشکر گزار بندے تھے۔

اس نامۂ اعمال اور ان شاہدوں کے ساتھ انسان خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔ پھر اس پیشی کی کیا کیفیت ہوگی؟ وہ اکیلا بے یار و مددگار کھڑا ہوگا :۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ

اب تم ہمارے پاس ویسے ہی یکہ و تنہا آئے ہو جیسا پہلے

وَتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ (۶:۱۱)

تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔ تم ان سب چیزوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہم نے تم کو دی تھیں۔

ہر شخص آپ اپنا حساب پیش کرے گا :۔

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ حَسِيْبًا (۱۷:۲)

ہر شخص کی برائی اور بھلائی کا نوشتہ ہم نے اسکے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور ہم اسکے لیے قیامت کے روز ایک کتاب نکالینگے جس کو وہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائے گا۔ اس سے کہا جائیگا کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھ آج خود تری اپنا حساب کرنیکے لیے کافی ہے۔

خاندانی اثرات کسی کام نہ آئیں گے :۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (۶۰:۱۲)

قیامت کے روز نہ تمہارے نسبی رشتے کسی کام آئیں گے اور نہ اولاد۔

سفارش سے کام نہ چلے گا :۔

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰:۲)

ظالموں کے لیے نہ کوئی دوست ہوگا نہ کسی سفارشی کی بات مانی جائے گی۔

رشوت نہ چلے گی :۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ (۲۶:۵)

وہ دن جبکہ نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد

اعمال تولے جائیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا :۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ (۲۱:۴)

ہم قیامت کے روز ٹھیک تولنے والے ترازو رکھدینگے کسی فرد پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا اور اگر رائی کے دانہ بھر بھی عمل ہوگا تو ہم اس کو لے آئیں گے اور ہم حساب کرنے کیلیے کافی ہیں۔

جزا اور سزا جو کچھ بھی ہوگی عمل کے مطابق ہوگی :-

اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۵ : ۲۸) آج تم کو ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا جیسے تم عمل کرتے تھے۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶ : ۱۹) اور ہر ایک کے لیے ویسے ہی درجے ہوں گے جیسے انہوں نے عمل کیے

یہ وہ پولیس اور عدالت ہے جس کا خوف انسان کے نفس میں بٹھا دیا گیا ہے۔ یہ دنیا کی پولیس نہیں ہے جس کی نگاہ سے انسان بچ سکتا ہے، نہ یہ دنیا کی عدالت ہے جس کی گرفت سے انسان شہادتوں کے فراہم نہ ہونے یا جھوٹی شہادتیں فراہم ہو جانے یا ناجائز اثرات پڑ جانے کی بدولت رہائی پا سکتا ہے۔ بلکہ یہ ایسی پولیس ہے جو ہر حال میں اس کی نگرانی کر رہی ہے اور یہ ایسی عدالت ہے جس کے گواہوں کی نظر سے وہ کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا، جس کے پاس اس کے ہر خیال اور ہر عمل کا ریکارڈ موجود ہے، اور جس کے فیصلے اتنے منصفانہ ہیں کہ کوئی گناہ سزا سے اور کوئی صواب جزا سے چھوٹ ہی نہیں سکتا۔

اعتقاد یوم آخر کا فائدہ اس طرح اسلام نے یوم آخر کے عقیدہ کو اپنے ضابطۂ اخلاق اور نظام شریعت کی پشت پناہ بنا دیا ہے جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لیے عقلی ترغیب بھی موجود ہے، اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی ہے۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنے بقا و استحکام کے لیے مادی طاقت اور جابرانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے، بلکہ وہ ایمان بالیوم الآخر کے ذریعہ سے انسان کے نفس میں ایک ایسے طاقتور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں کے انجام سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کی بنا پر گناہ ٹھیرایا ہے۔

قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ اس عقیدہ کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ (۲ : ۲۸) "اور اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا ہے" راہ خدا میں سرفروشی کے لیے ابھارا جاتا ہے تو ساتھ ہی یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر تم مارے جاؤ گے تو درحقیقت مر نہ جاؤ گے بلکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤ گے۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۲: ۱۹) مصائب پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ صابرین کے لیے خدا کی طرف سے عنایت اور رحمت ہے۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ (۲: ۱۹) بے خوفی اور بہادری کا جذبہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (۲: ۳۳) جو لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے انھوں نے کہا کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعت بھی بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔ سخت سے سخت مشکلات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کی قوت یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے کہ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا (۹: ۱۱) جہنم کی آگ دنیا کی گرمیوں سے زیادہ سخت ہے۔ نیک کاموں میں مال خرچ کرنے کے لیے یہ کہہ کر ابھارا جاتا ہے کہ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ (۲: ۳۰) جو کچھ تم خیرات کرو گے اس کا پورا اجر تم کو ملے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہ ہوگا۔ بخل سے روکنے کے لیے فرمایا جاتا ہے۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (۳: ۱۸) جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مالدار کیا ہے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ان کے لیے اچھا ہے، بلکہ درحقیقت یہ ان کے حق میں برا ہے جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔ سود خواری کے کاروبار سے دست بردار ہونے کے لیے یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ (۲: ۳۸) اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔ متاعِ دنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوشحالی پر رشک نہ کرنے کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ لَٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ (۳: ۲۰) ...

(باقی)

کتب سماوی پر ایک نظر

(۸)

عہد جدید (اناجیل وغیرہم)

(از جناب ذوقی شاہ صاحب)

کثرت ازدواج | اس مسئلہ پر دنیائے مغرب میں عام طور پر بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اور یہ گمان کیا جاتا ہے کہ مذہب عیسوی ایک وقت میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کی اجازت نہیں دیتا حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ بائیبل اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

ہم متعدد بار بتلا چکے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کو منسوخ نہیں فرمایا اور نہ عیسائیوں کو احکام توریت کی پابندی سے مستثنیٰ کیا ہے۔ اصلی اور سچی عیسویت بائیبل کی رو سے توریت اور انجیل دونوں کی پابندی پر مشتمل ہے پہلے توریت کو لیجیے اور مندرجہ ذیل حوالجات کو ملاحظہ فرمائیے:۔

پیدائش باب ۱۶ آیہ ۳ و ۴، باب ۲۵ آیہ ۱، باب ۳۵ آیہ ۲۳ تا ۲۶ - احبار باب ۱۸ آیہ ۱۸ - استثنار باب ۲۱ آیہ ۱۵ - قاضیون باب ۸ آیہ ۳۰ - اول سموئیل باب ۱ آیہ ۱ و ۲ و ۳، باب ۲۵ آیہ ۴۲ و ۴۳ و ۴۴، دوم سموئیل باب ۳، باب ۵ آیہ ۱۳، باب ۱۱ آیہ ۲۷، باب ۱۲ آیہ ۸، باب ۵ آیہ ۱۶ - اول سلاطین باب ۱۱ آیہ ۱ تا ۴، باب ۱۱ آیہ ۱ تا ۳ - اول تواریخ باب ۳ آیہ ۱ تا ۹، باب ۱۴ آیہ ۳ - دوم تواریخ باب ۱۱ آیہ ۲۱، باب ۱۳ آیہ ۲۱، باب ۲۴ آیہ ۲ و ۳ -

کتب عہد عتیق کے متذکرہ بالا مقامات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد بیویاں کرنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اسمیں برکت اور برگزیدگی بھی ہے اور اللہ کے برگزیدہ بندوں اور انبیاء علیہم السلام کا اس پر نہایت شدومد کے ساتھ بکثرت عمل بھی رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے تین نکاح کیے۔ بی بی سارہ بی بی ہاجرہ اور بی بی قطورہ سے، اور اگر بی بی قطورہ سے عقد بی بی سارہ کی وفات کے بعد بھی تسلیم کیا جائے تب بھی دو بیویوں کا بیک وقت مجتمع ہونا تو بالاتفاق ثابت ہے یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں تھیں۔ حضرت سموئیل نبی کے والد ماجد کی دو بیویاں تھیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی دو بیویاں تھیں۔ داؤد علیہ السلام کی نو بیویاں تھیں (یہ وہ برگزیدہ نبی ہیں جنکی نسل سے بلحاظ جسم مسیح ؑ کا پیدا ہونا بائبل میں بیان کیا گیا ہے۔ بڑی عظمت کے ساتھ آپکا ذکر آیا ہے اور باستثناء اس معاملہ کے جو زوجہ اوریاہ کے متعلق بائبل میں آپ سے منسوب کیا گیا ہے اور کوئی الزام آپ پر نہیں لگایا گیا حتیٰ کہ آپ کی کثرت ازدواج پر بھی آپ پر کوئی اعتراض نہیں آپکی زبور یہودیوں اور عیسائیوں کی کتب مقدسہ میں اب تک کمال عزت وعظمت کے ساتھ موجود ہے) سلیمان علیہ السلام کی سات سو (۷۰۰) بیویاں تھیں اور تین سو (۳۰۰) حرم (آپ پر بھی بائبل میں اس کثرت ازدواج پر کہیں کوئی الزام نہیں آیا) حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کی اٹھارہ (۱۸) بیویاں تھیں اور ساٹھ (۶۰) حرم۔ حضرت سلیمان کے پوتے ابیاہ کی چودہ (۱۴) بیویاں تھیں۔ حضرت جدعون کی بھی بہت سی بیویاں تھیں۔

اب اناجیل کو لیجیے۔ اناجیل میں کہیں توریت کی اس اجازت کو منسوخ نہیں کیا گیا۔ عہد جدید کی کتب مقدسہ میں سے کسی کتاب میں ایک سے زائد بیویوں کے ایک ہی وقت میں جمع کرنے کی ممانعت نہیں آئی۔ صرف دو موقعوں پر اس قسم کی عبارت پائی جاتی ہے جس سے شائد اس نوع کی ممانعت کا التباس ہوا ہو۔ پولوس کے تمطاؤس کے نام پہلے خط کے باب ۳ آیہ ۲ میں مندرجہ ذیل عبارت واقع ہوئی ہے:-

"یہ بات سچ ہے کہ جو کوئی کلیسے کی نگہبانی کی آرزو رکھتا ہے وہ اچھا کام چاہتا ہے۔ پس چاہیئے کہ نگہبان بے عیب، ایک جورو کا شوہر، پرہیزگار، صاحب تمیز، مسافر دوست تعلیم دینے میں قابل ہو"

اسی سے ملتی جلتی اور اسی مضمون کی عبارت پولوس کے طیطس کے نام خط کے باب ۱ آیہ ۶ میں پائی جاتی ہے۔ اول تو

ان دونوں عبارتوں کو اناجیل اربعہ سے کوئی تعلق نہیں - یہ پولوس کے مشکوک اور غیر معتبر خطوط کی عبارت ہے۔ اگر ان خطوط کو معتبر بھی مانا جائے تو یہ پولوس کی ذاتی رائے ہے جو نہ شریعت موسوی میں ترمیم کا باعث ہو سکتی ہے نہ شریعت عیسوی میں علاوہ ازیں پولوس کی یہ رائے بھی صرف پادریوں اور کلیسے کے خدام سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ عام عیسائیوں سے - پادریوں اور مذہبی خدمت کرنے والوں کو صرف مشورہ دیا گیا ہے کہ بہتر ہو اگر ان کے ایک ہی بیوی ہو تاکہ بیوی بچوں میں ان کا زیادہ وقت صرف نہ ہو اور کلیسا کی خدمت کے لیے اونہیں فرصت زیادہ ملے - اس مشورہ کی رو سے بھی پادریوں کے لیے بہتر ہے اگر وہ ایک ہی بیوی رکھیں لیکن ایک سے زائد بیویاں اگر انکے پاس ہوں تو اسے گناہ ہرگز نہیں قرار دیا جا سکتا - یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ قرنتیوں کے باب ۷ آیہ ۱ میں یہی پولوس لکھتے ہیں کہ :-

"مرد کے لیے یہ اچھا ہے کہ عورت کو نہ چھوئے"

اور اسی باب کی آیہ ۲۸ میں مردوں اور عورتوں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے مگر اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے والوں کو گنہ گار بھی نہیں ٹھیرایا گیا - چنانچہ اسی باب میں جہاں آیہ ۱ میں مرد کے لیے عورت کا نہ چھونا اچھا بیان کیا گیا ہے وہاں آیہ ۲ میں فوراً یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر حرامکاری سے بچنے کے لیے کوئی مرد جورو کرے یا عورت شوہر کرے" تو مضائقہ نہیں - اور آیہ ۲۸ میں جہاں مردوں اور عورتوں کو شادی کے خلاف مشورہ دیا گیا ہے وہاں اوسی آیہ میں یہ بھی صاف جتلا دیا گیا ہے کہ اگر کوئی نکاح کرے تو گناہ نہیں - بالکل اسی نوع کا مشورہ پادریوں کو بھی دیا گیا کہ اگر وہ ایک ہی بیوی پر قناعت کریں تو مذہبی خدمت کا انجام دینا ان کے لیے زیادہ آسان ہوگا - اگر ایک سے زیادہ بیوی کا ایک ہی وقت میں رکھنا مذہباً گناہ ہوتا تو ممانعت عام ہوتی، نہ کہ پادریوں کے لیے خاص - اس ممانعت خاص سے اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ اوس زمانہ میں عیسائیوں میں کثیر الازدواجی کی رسم عام تھی جس سے پادریوں کو باز رکھنے کی کوشش کی گئی - اس ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حواریوں کے زمانہ میں، نیز اوس کے بعد بھی اغیار کے ہاتھوں بیچارے عیسائیوں پر ایسے شدید مظالم اور مصائب کی بارش ہوتی رہی ہے کہ اون بیچاروں کو وطن چھوڑنا پڑتا تھا برسوں جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپنا پڑتا تھا جب پکڑے جاتے تھے تو بڑی اذیت سے قتل کیئے جاتے تھے - باپ کے سامنے بیٹا اور بیٹے کے

سامنے باپ قتل ہوتا تھا۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جاتے تھے۔ جب یہ لوگ بھاگتے تھے تو سارے گھر کو ساتھ لے کر بھاگنا اور عورتوں بچوں سمیت جنگلوں پہاڑوں میں بسر کرنا بہت دشوار ہوتا تھا۔ پادری **والٹس** صاحب مصر کی بعض قبروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رومی سلاطین نے عیسائیوں کو دس بار جو خوفناک اور دردانگیز ایذائیں پہونچائیں اور تباہیاں ان پر برپا کیں ان میں عیسائی لوگ انہیں غاروں میں پناہ لیتے تھے اور اپنے مُردوں کو انہیں میں دفن کر دیتے تھے۔ **قرنتیوں** کے باب ۷، آیات ۲۶ تا ۲۹ میں انہیں مصائب کی جانب اشارہ ہے۔ ان حالات میں ایک بیوی کا ہونا بھی مصیبت ہوتا ہے چہ جائیکہ متعدد بیویاں ہوں، خصوصاً پادریوں کے لیئے جن کے کاندھوں پر کلیسا کی خدمت اور متبعین مسیح کی رہنمائی کا بھی بار تھا۔ ان پادریوں کے لیے ان حالات میں یہ ایک عارضی مشورہ تھا جو پولوس نے پیش کیا تھا اور وہ کوئی مذہبی حیثیت نہ رکھتا تھا۔

عیسائیوں میں ایک فرقہ ہے جو **مورمن** کے نام سے مرسوم ہے۔ ان میں ہر عیسائی کو بارہ بیویاں رکھنے کی اجازت ہے۔ ان کے پیشوا **برگہم ینگ** (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۷ء) کے پاس ایک وقت میں پچاس (۵۰) بیویاں رہ چکی ہیں۔ عیسائی عقیدہ کے بموجب عیسیٰ علیہ السلام کی بھی دو بیویاں قرار پاتی ہیں۔ ایک کلیسہ قدیم یعنی جماعت یہود۔ اور دوسری کلیسہ جدید یعنی جماعت نصاریٰ (دیکھو دوم قرنتیوں کا باب ۱۱ آیہ ۲۔ اور مکاشفات باب ۱۹ آیہ ۷، باب ۲۱ آیہ ۹، باب ۲۱ آیہ ۱۷)۔ پراٹسٹنٹ فرقہ کے بانی **مارٹن لوتھر** نے ایک دولت مند شخص **فلپ** کو دو بیویاں رکھنے کی اجازت دی۔ **لوتھر** صاحب اپنی بعض تحریروں میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ انسان دس یا زیادہ بیویاں ایک ساتھ رکھ سکتا ہے۔ تاریخ میں عیسائی دنیا کی متعدد مشہور ہستیاں ایسی پائی جاتی ہیں جنھوں نے ایک ہی وقت میں متعدد بیویاں کیں۔ جرمنی اور فرانس کے متعدد بادشاہ تک اس زمرہ میں شامل ہیں۔ خود انگلستان کے بادشاہ **ہینری ہشتم** نے جو فرقہ پراٹسٹنٹ کے زبردست سرپرست تھے متعدد نکاح کیے اور ایک وقت میں تین بیویاں رکھیں۔ جرمنی کے پادری **بونیفس** نے پوپ **گریگوری** سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں دریافت کیا کہ انسان کو کس حالت میں دو بیبیاں کرنی جائز ہیں۔ پوپ نے جواب دیا کہ جب بیوی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہو کہ

خاوند اس سے مباشرت نہ کر سکے اس صورت میں خاوند کو دوسرا نکاح کر لینا درست ہی بشرطیکہ وہ بیمار بیوی کی ہر طرح خبر گیری کرتا رہے۔ عیسائیوں نے خود کثیر الازدواجی کے جواز میں متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ رومن کیتھولک فرقہ کے راہبوں کی ایک جماعت کپوشینز کے رہنما برناڈا وکینس نے اس رسم کے پسندیدہ ہونے کی تائید میں ایک کتاب لکھی ہے۔ ان تائید کرنے والوں میں سے جو کہ متعدد ہیں سب سے زیادہ مشہور شخص جان ملٹن (۱۶۰۸ء–۱۶۷۴ء) ہے جس نے اس رسم کی حمایت میں بڑا زور صرف کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب مضمون در باب مذہب عیسویت میں اس امر کے ثبوت میں انجیل سے بہت سے فقرے نقل کرتا ہے پھر لکھتا ہے کہ :۔

"علاوہ اس کے خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو استعارہ کے طور پر ایک حکایت میں مرد بتایا ہے (حزقی ایل باب ۲۳) جس نے احولا اور احولیا دو عورتوں سے نکاح کیا۔ اگر یہ رسم در اصل بری ہوتی تو خدا تعالیٰ استعارہ میں بھی اس رسم کو اپنے لیئے اختیار نہ کرتا جس رسم کی انجیل میں ممانعت نہ ہو ہم اسکو کسی دلیل سے برا اور ذلیل کہیں۔ کیونکہ انجیل نے کسی ملکی قانون کو جو اس سے پہلے رائج تھا برا نہیں کہا۔ انجیل میں صرف یہ حکم ہے کہ ایلڈر اور ڈیکن پادری وہ لوگ بنائے جائیں جو صرف ایک بیوی رکھتے ہوں (اول تمطاؤس باب ۳ آیۃ ۲ اور طیطس باب آیۃ ۶) اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ایک سے زیادہ نکاح کرنا گناہ ہے کیونکہ اگر گناہ ہوتا تو یہ حکم سب کے لیے عام ہوتا صرف پادریوں ہی کے لیے نہ ہوتا۔ اس حکم میں یہ مصلحت ہی کہ ایک بیوی والے دنیا میں اتنا گرفتار نہ ہونگے جتنا کہ زیادہ بیویوں والے اور اسوجہ سے یہ لوگ گرجے کا کام بخوبی انجام دے سکیں گے۔ یہ ممانعت بھی کچھ گناہ ہونیکے سبب سے نہیں ہی۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سب کو ایک سے زیادہ بیبیاں جمع کرنے کی اجازت ہے اور اکثر لوگوں نے اس رسم کو اختیار بھی کیا ہے حضرت موسیٰ نے کوئی ممنوعی صورت بیان نہیں کی۔ ہمارے اکثر نبیوں نے ایک سے زائد بیبیاں مجتمع کیں

لہٰذا مجھے یقین ہے کہ ایسی بے ادبی کوئی نہ کرے گا کہ اس رسم کو حرام یا ناجائز ٹھیرائے کیونکہ انجیل میں صاف لکھا ہے کہ حرامکاروں اور زانیوں کو اللہ سزا دیگا اور اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام انکا میں خود محافظ ہوں۔ لہٰذا ایک سے زیادہ بیبیاں جمع کرنا نکاح ٹھیرا اور نکاح ہر طرح حلال اور درست ہے حضرت موسیٰ ہی فرماتے ہیں کہ نکاح کرنا بہت اچھا ہے اور گناہ نہیں ہے۔"

پادری فاکس صاحب اپنی کتاب الموسوم بہ "غلطیوں کی اصلاح" مطبوعہ امریکن مشن پریس لکھنؤ ۱۸۹۴ء کے صفحہ ۲۰۶ و ۲۰۷ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"تعدد ازدواج کے مقدمہ میں ہم بے تردد تسلیم کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں بھی اس دستور نے رواج پایا تھا اور خدا نے بھی اسکو منع نہیں کیا بلکہ اسی رسم پر چلنے والوں کو اکثر برکت کا وعدہ فرمایا ہے۔"

یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر رسول عربی صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بعض عیسائی اس معاملہ میں اعتراض پیش کیا کرتے ہیں اوس کے جواب میں ایک عیسائی مصنف ہی کی تحریر کو پیش کر دیا جائے۔ جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب کے صفحہ ۱۴۴ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :۔

"اور یہ جو عیسائی الزام لگاتے ہیں کہ آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) شہوت پرست تھے (نعوذ باللہ) یہ اون کا الزام باطل ہے۔ کیونکہ جب آپ نے ظہور فرمایا اوس زمانہ میں اہل عرب میں بے انتہا نکاحوں کا رواج تھا۔ پس یہ امر بظاہر بیہودہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا شخص جو خود شہوت پرست ہو وہ بدکاری کی اس رسم کو معدوم کرے۔ علاوہ اسکے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ہم یہ بات بھی آنحضرت (صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم) کی طرف سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ بھی اپنے ہموطنوں کی مانند عورتوں سے بہت رغبت رکھتے تھے اور آپنے

یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ آپ اُن انسانی خواہشوں سے بری ہوں جو سب آدمیوں کو ہوتی ہیں۔ بلکہ برعکس اسکے یہ فرمایا ہے کہ میں بھی تمہیں جیسا آدمی ہوں۔ اور بمقابلہ حضرت داؤد کے جو نبی اور بادشاہ تھے اور جن کی تعریف انجیل میں لکھی ہے کہ وہ ایسے آدمی تھے جو خدا کا سا دل رکھتے تھے، آنحضرت (صلے اللہ علیہ وسلم) ایسے صاف تھے جیسے ایک برف کا ٹکڑا ڈائنا (عفت و پاکدامنی کی دیوی) کے مندر پر گرا ہوا ہو۔ ساؤل کی دوسری دختر بتشبست حضرت داؤد کی پہلی زوجہ تھی۔ اس زوجہ کو اس کے باپ نے آپکی جلا وطنی کے زمانہ میں آپ سے لے لیا۔ بعد ازاں آپ نے مسلسل کتنے ہی نکاح کیے مگر باین ہمہ اپنی پہلی زوجہ کا بھی دعویٰ برابر کرتے رہے۔ حضرت داؤد نے ایک غیر مختون بادشاہ کی بیٹی سے بھی بے تکلف نکاح کر لیا اور اگرچہ آپ کے ہاں اکثر بیویوں سے اولاد بھی تھی مگر آپ یروشلم میں حرمیں کرتے رہے اور آخر کار بنت سبع کے معاملہ میں آپنے حرام اور خون ناحق بھی کیا (نعوذ باللہ) جب حضرت داؤد ایسے ضعیف ہو گئے کہ آپ پر ہر چند کپڑے ڈالے جاتے مگر آپ کو گرمی نہ پہونچتی اور سردی موقوف نہ ہوتی تو یہ تجویز ٹھیری کہ ایک نوجوان باکرہ عورت بہم پہونچائی جائے جو آپ کی خدمت کرے اور آپ کے ساتھ ہم خواب ہو۔ چنانچہ آپنے لوگوں کو حکم دیا کہ ایک نہایت حسین اور نوعمر عورت لائی جائے"۔

اقتباس مندرجہ بالا کے بعد ہم اپنی طرف سے صرف اس اضافہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ جو لوگ خود شیشے کے مکانوں میں رہتے ہوں ان کا، دوسروں پر پتھر پھینکنے میں پیش قدمی کرنا عقل مندی کے خلاف ہے۔

مہر | عورتوں کو نکاح میں مہر دینا شریعت موسوی و عیسوی میں داخل ہے۔ ملاحظہ فرمائیے پیدائش باب ۳۴ آیہ ۱۲۔ خروج باب ۲۲ آیہ ۱۶۔ استثناء باب ۲۲ آیہ ۲۹۔ اول سموئیل باب ۱۸ آیہ ۲۵۔

شوہر کی اطاعت | لوگ موجودہ عیسائی دنیا کی عام روش دیکھ کر تعلیم عیسوی کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا

نہ ہوں۔ انجیلی تعلیم عورتوں ہی کو مردوں کی فرمانبرداری کا حکم دیتی ہے۔ **آفسیون** باب۵ آیات ۲۲ و ۲۳ و ۲۴ میں ہے کہ:-

"اے عورتو! اپنے شوہروں کی ایسی فرمانبردار ہو جیسے خداوند کی۔ کیونکہ شوہر زوجہ کا سر ہے جیسے کہ مسیح بھی کلیسہ کا سر ہے اور وہ بدن کا بچانے والا ہے۔ تو بھی جیسے کلیسہ مسیح کی فرمانبردار ہے ویسے ہی بیویاں بھی ہر بات میں اپنے شوہروں کی ہوویں"

اسی طرح اول **تمطاؤس** باب ۲ اور اول **پطرس** باب ۳ میں بھی عورتوں کو اپنے شوہروں کی اطاعت کا تاکیدی حکم موجود ہے۔

فساق و فجار سے اجتناب عیسائی رواداری کا وعظ کہنے والے اس بات کو غالباً دلچسپی سے دیکھیں گے کہ احکام انجیل کی رو سے عیسائیوں کو بالکل اجازت نہیں کہ وہ اپنے ان عیسائی بھائیوں تک سے میل جول رکھیں اور ان کے ساتھ کھانا تک کھائیں جو حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والے یا شرابی یا ظالم ہوں۔ اول **قرنتیوں** کے باب ۵ آیۃ ۱۱ میں ہے کہ:-

"اگر کوئی بھائی کہلا کر حرام کار یا لالچی یا بت پرست یا گالی دینے والا یا شرابی یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا"

توحید و تثلیث تثلیث کے مسئلہ نے عیسائی دنیا میں بڑا تہلکہ برپا کیا، بڑی خونریزیاں کیں اور بہت سے فرقے پیدا کر دیئے۔ مگر ہم یہاں صرف انجیل کی روشنی میں اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

جن کتابوں کو آسمانی ہونے کا دعویٰ ہے اونکے مطالعہ کرنے والوں کے پاس ان کتابوں کی حقانیت دریافت کرنے کے لیئے ایک اتنا اچھا معیار ہے جس میں مغالطہ نہیں ہونے پاتا۔ وہ معیار توحید کی تعلیم ہے۔ جن کتب سماوی میں توحید کو جس خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہو اتنی ہی حقانیت کا ان میں پتہ چلتا ہے اور انکی عبارتیں جس قدر توحید اصلی سے ہٹی ہوئی ہوں اتنا ہی ان میں تحریف و الحاق کا گمان ہوگا۔ اناجیل مروجہ میں

باوجود اس کے کہ تحریف و الحاق کے وقوع کا عیسائی علماء کو اعتراف ہے تعجب ہے کہ توحید الٰہی اور عبدیت مسیح کی تائید میں کافی مواد موجود ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ باوجود اس مواد کے عیسائیوں نے تثلیث کو بے دھڑک اپنا مسلک قرار دیا اور الوہیت مسیح کے قائل ہوگئے اقتباسات ذیل ملاحظہ ہوں :۔

"یسوع نے اس کے جواب میں کہا کہ سب حکموں میں اول یہ ہے کہ اے اسرائیل سن تو
خداوند جو ہمارا خدا ہے ایک ہی خداوند ہے" (مرقس باب ۱۲ آیہ ۲۹)

اسی نوع کا مضمون متی باب ۲۲ آیہ ۳۶ تا ۴۰ میں بھی موجود ہے اور اس توحید، نیز ہمسایہ کو پیار کرنے کی بابت آیہ ۴۰ میں مسیح کا یہ قول بھی درج ہے کہ "انہیں دو احکام پر ساری شرع اور سب انبیاء کی باتیں موقوف ہیں" اس سے زیادہ زبردست ثبوت دین مسیح کی بنیاد کے توحید پر ہونے کا کیا ہو سکتا ہے ؟

"خدا ایک ہے اور خدا اور آدمیوں کے بیچ ایک آدمی بھی درمیانی ہے وہ مسیح یسوع ہے"
(اول تمطاؤس باب ۲ آیہ ۵)

توحید الٰہی اور عبدیت مسیح کا اس سے واضح تر اعتراف کیا ہو سکتا ہے ؟ کتب عہد جدید میں بکثرت ایسی عبارتیں موجود ہیں جن سے عیسیٰ علیہ السلام کا ابن آدم اور نبی اور اللہ کا برگزیدہ بندہ ہونا پایا جاتا ہے آپ کے حواری بھی آپ کو اللہ کا بندہ اور نبی تسلیم کرتے تھے مگر باوجود ان تمام باتوں کے بعد کے عیسائی علماء اور تثلیث پر جم گئے اور یہ عقیدہ رکھنے لگے کہ خدا کی ذات واحد تین اقانیم پر مشتمل ہے وجود حیات اور علم جس سے باپ بیٹا اور روح القدس مراد ہیں۔ بعض عیسائی فرقوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو بھی تثلیث میں داخل کر لیا۔

منجملہ دیگر اعتراضات کے ایک عقلی اعتراض جو اس تثلیث پر وارد ہوتا ہے یہ ہے کہ اگر اقانیم ثلاثہ میں سے ہر واحد کو ہر قسم کے کاموں کی یکساں قدرت کا مالک تسلیم کیا جائے تو تعین تعداد ثلاثہ اور تخصیص تثلیث کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اگر اقانیم ثلاثہ میں سے ہر اقنوم کو بطور خاص جدا جدا کاموں کی قدرت کا مالک تسلیم کیا جائے تو ہر واحد کی شان میں نقص عظیم کا ہونا لازم آئیگا کہ ایک کا کام دوسرا نہیں کر سکتا اور اس بناء پر ذات واحد میں تقسیم کا تعین تثلیث کی ضرورت باقی اور ثابت

قادر مطلق کی شان سے بہت بعید ہے۔

عیسائی توحید کا بھی دم بھرتے ہیں اور تثلیث کا بھی مگر یہ نہیں سمجھا سکتے کہ اس تثلیث کے ہوتے ہوئے توحید قائم کیونکر رہ سکتی ہے۔جب سوال کیا جاتا ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اس مسئلہ کے سمجھنے سے عقل انسانی قاصر ہے انجیل سے بھی وہ کوئی سند پیش نہیں کرسکتے۔توریت و انجیل میں لفظ "تثلیث" کسی جگہ نہیں پایا جاتا اور اسکی تعلیم نہ عیسیٰ علیہ السلام نے کسی کو دی نہ آپکے کسی حواری نے۔چنانچہ میزان الحق مطبوعہ مرزاپور (۱۸۴۳ء) میں جو کہ ایک عیسائی کی تصنیف ہے باب ۲ فصل ۴ صفحہ ۱۴۶ پر درج ہے کہ:۔

"مسیحیوں کے اعتقاد [illegible] عمدہ مطلب کو تثلیث یا ثلاث واحد کہتے ہیں اور اگرچہ یہ لفظ یعنے انجیل [illegible] نہیں پائے جاتے مگر انجیل کی اس عمدہ تعلیم کو [illegible] ایسا نام ہوا ہے"

باوجود میزان الحق کی اس عبارت کے عہد نامہ جدید میں تین مقامات ایسے ہیں جہاں تثلیث کا لفظ صاف صاف تو نہیں آیا مگر باپ بیٹے اور روح القدس کا ذکر ایک جگہ جمع ہو گیا ہے۔ایک تو متی باب ۲۸ آیۃ ۱۹ میں ہے کہ:۔

"اس لیے تم جا کر سب قوموں کو شاگرد کرو اور انہیں باپ اور بیٹے اور روح القدس کے نام سے بپتسمہ دو"

یہ ذکر کسی اور انجیل میں نہیں۔اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اور انجیلوں میں بھی اس کا ذکر ضرور آتا جیسا کہ متعدد امور میں ایک ہی بات کا مختلف اناجیل میں اعادہ کیا گیا ہے۔لیکن اگر اس عبارت کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے تثلیث ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب قوموں کو باپکے نام سے جو کہ خدا ہے اور بیٹے کے نام سے جو کہ اسکا رسول ہے اور روح القدس سے پیدا ہوا ہے بپتسمہ دیکر شاگرد کرو۔اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ خدا کے نام کے ساتھ اسکے رسول کا نام آنا بھی ضروری ہے باپ اور بیٹے کے الفاظ کا استعمال اور

زمانہ کی رسم کے مطابق محض رسمی ہے جس پر مزید گفتگو آگے آئے گی۔

دوسرے دوم قرنتیوں کے باب ۱۳ آیہ ۱۴ میں ہے کہ :-

"اب خداوند یسوع مسیح کا فضل اور خدا کی محبت اور روح قدس کی صحبت تم سبھوں کے ساتھ

ہووے۔ آمین"

یہ صرف دعائیہ کلمات ہیں اور اقانیم ثلاثہ کے ثبوت کا ان میں شائبہ تک نہیں۔

تیسرے اول یوحنا باب ۵ آیہ ۷ میں ہے کہ :-

"تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح قدس اور یہ تینوں ایک ہیں"

یہاں البتہ تثلیث کا صاف صاف اظہار ہے اور یہی آیت اہل تثلیث کے تثلیثی عقیدہ کی بنیاد ہے لیکن بڑے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس آیت کے الحاقی ہونے پر جمیع محققین علمائے عیسوی کا اتفاق ہے۔ پادری فانڈر صاحب اور گریسباخ اور شولز ان لوگوں میں سے ہیں جو اس کے الحاقی ہونے کے معترف ہیں۔ لندن میں ۱۸۳۳ء میں مسیحی علماء کی جانب سے ایک کتاب "لائبریری آف یوشل نالج" شائع ہوئی جس میں مرقوم ہے کہ اسحٰق نیوٹن نے ایک پچاس صفحوں کا رسالہ لکھا ہے جس میں نامۂ یوحنا اور نامۂ پولوس کے ان دو فقروں کے متعلق تحقیقی بحث کی ہے جن سے مسئلہ تثلیث پیدا ہوا ہے اور نیوٹن کی تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں کاتبوں نے تبدیلی کی ہے۔ اس سے دونوں آیات مندرجہ بالا یعنی دوم قرنتیوں کے باب ۱۳ آیہ ۱۴ اور اول یوحنا باب ۵ آیہ ۷ کے الحاقی ہونیکا ثبوت پایا جاتا ہے ۱۸۷۰ء میں شہر کنٹربری (انگلستان) میں بائیبل کی تنقید کی غرض سے ستائیس (۲۷) مشہور عیسائی علماء کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں بالاتفاق یوحنا کی متذکرہ بالا آیت الحاقی قرار دی گئی۔

یہودیوں میں تو باوجود عقائد میں اختلافات باہمی کے کوئی شخص بھی عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت تو درکنار رسالت تک کا قائل نہیں۔ نہ توریت اور صحیفِ انبیائے بنی اسرائیل میں کہیں تثلیث کی تعلیم پائی جاتی ہے۔

(باقی)

تنزیل و تاویل

سورۂ فاتحہ

(از جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی)

اس سورہ کو فاتحۃ الکتاب اور فاتحۃ القرآن بھی کہتے ہیں، اس لیے کہ کتاب الٰہی کا آغاز اسی سورہ سے ہوتا ہے۔ اس کا ایک نام ام الکتاب بھی ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال۔

جن باتوں کی طرف بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اشارات کیے گئے ہیں ان کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سورۂ فاتحہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں صفات الٰہیہ کو بیان فرمایا اور مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے احوال آخرت کی طرف اشارہ فرمایا۔ اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سے مباحث نبوت و رسالت، ایمان اور کفر، سعادت اور شقاوت، ہدایت اور ضلالت کے فرق کی طرف اشارہ فرمایا۔

تمام قرآن انہی مضامین کی تفصیل ہے جو سورۂ فاتحہ میں اجمالاً ذکر فرمائے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے اس سورت کا نام ام الکتاب ہے۔ اور چونکہ کتاب الٰہی کی ہر سورۃ انہی مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے جو اجمالاً بسم اللہ الرحمن الرحیم میں درج ہیں، اس لیے ہر سورۃ کی ابتداء میں بسم اللہ کا لکھنا اور پڑھنا مسنون ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

حقیقی ستایش اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے

(۱) جو فعل علم، اختیار، قدرت اور ارادہ سے صادر ہو اسکی واقعی خوبی بیان کرنے کو "حمد" کہتے ہیں۔ مدح میں نہ فعل کا اختیاری ہونا ضروری ہے اور نہ اس خوبی کا واقعی ہونا لازمی۔ اس وجہ سے مدح کسی وقت ممنوع بھی ہوجاتی ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:-

احثوا التراب فی وجوہ المداحین — مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو

مگر حمد سے کسی وقت منع نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اس میں واقعی خوبی کا اظہار ہوتا ہے۔

بعض علماء نے تعریف حمد سے قید اختیار کو حذف کر دیا ہے اس لیے کہ اس قید کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ شانہٗ کی صفات ذاتیہ کی ثنا کو حمد کہنا دشوار ہوگا کیونکہ صفات ذاتیہ مثل علم و قدرت حق تعالیٰ شانہٗ کے افعال اختیاری نہیں ہیں۔ لیکن یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ یہ صفات اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان کے ثمرات ضرور اختیاری ہیں

حمد اور مدح میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حمد انہیں صفات کمال پر ہو سکتی ہے، جن کا صفات کمال ہونا قطعی اور یقینی ہو اور ان میں کسی قسم کے نقص کا شائبہ بھی نہ ہو۔ بخلاف مدح کے کہ اس میں نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت قطعاً اور یقیناً صفت کمال ہو، ظناً بھی صفت کمال ہو تو مدح کے لیے کافی ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت کمال شائبہ نقص سے پاک ہو، بلکہ اگر اس میں کچھ نقص بھی ہو تب بھی مدح ہو سکتی ہے۔

نیز حمد میں یہ ضروری ہے کہ محاسن و کمالات کا ذکر محبت اور اجلال کے ساتھ ہو اور مدح میں یہ ضروری نہیں۔ مطلقاً محاسن اور کمالات کے بیان کرنے کو خواہ وہ محبت اور اجلال سے ہو یا نہ ہو مدح کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ لفظ حمد سے جو تعظیم و تفخیم مترشح ہوتی ہے وہ لفظ مدح سے نہیں ہوتی اس لیے حمد کا اکثر اطلاق اُس معنی حمید ہی پر ہوتا ہے۔

حمد کے بعد سب سے پہلے اسم ذات کو ذکر فرمایا اور اُس کے بعد اسماء صفات و افعال کو تاکہ ذاتاً اور صفتاً ہر طرح سے اس کا مستحق حمد و ثنا ہونا معلوم ہو جائے۔

(۲) ربوبیت بمعنی پرورش کرنا اور کسی شئی کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا۔ اگرچہ والدین سے بھی یہ فعل ظہور میں آتا ہے۔ کما قال تعالیٰ

قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔ کہہ کہ پروردگار! ماں اور باپ پر رحم کر جس طرح ان دونوں نے مجھ کو بچپن میں پرورش کیا۔

مگر والدین کی ربوبیت نور آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی اور خانہ زاد نہیں بلکہ نور زمین کی طرح مستعار اور عطاء غیر ہے۔ جس طرح نور زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے، اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیہ الٰہی ہے نیز حقیقی تربیت جب ہو سکتی ہے کہ کسی شئی کو نیست سے ہست کیا جائے، پھر اس کے تمام اسباب تربیت کو پیدا کیا جائے اور پیدا کرنے کے بعد انتفاع کے تمام موانع دور کر دئے جائیں۔ تب تربیت مکمل ہو سکتی ہے۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں مگر نہ اولاد انکی مخلوق ہے۔ اور نہ وہ سامان تربیت کے خالق ہیں بلکہ سب کا سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے نیز والدین کی تربیت چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہے، تمام عالم کے لیے عام اور محیط نہیں پس قابل ستایش وہی ربوبیت ہو سکتی ہے جو اصلی اور ذاتی ہو۔ مستعار اور عطاء غیر نہ ہو۔ ہر طرح سے کامل اور مکمل ہو کسی قسم کا اس میں نقص نہ ہو۔ تمام عالمین کے لیے عام اور محیط ہو اس لیے ارشاد ہوا کہ:۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ۔ یعنی حقیقی ستایش خدا تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے، جسکی ربوبیت اصلی اور ذاتی اور کامل ہونے کے علاوہ تمام جہانوں کے لیے عام اور محیط ہے۔ اسی وجہ سے جب فرعون نے کہا کہ:۔

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِينَ رب العالمین کیا چیز ہے

تو موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ ارشاد فرمایا:۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وہ جو تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے مابین کی مخلوقات کا پروردگار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد شاید فرعون کو یہ تردد ہوا ہو کہ تربیت کو صرف ذات

خداوندی میں مختص کر دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم والدین اور آفتاب اور ماہتاب کی تربیتوں کا بھی روزانہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں، اس لیے موسیٰ علیہ السلام دوبارہ جواب کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ — وہ رب ہی تمہارا اور تمہارے اگلے آباء واجداد کا

یعنی تمہارے آباء واجداد کی تربیت اصلی اور ذاتی نہیں، بلکہ عطیۂ الٰہی ہے، تمہارا اور تمہارے تمام آباء اولین کا حقیقی رب اور پروردگار وہی ہے۔ اور تیسری بار فرمایا:۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ۔ — وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور ان کے درمیان کا اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔

یعنی آفتاب اور ماہتاب کو اپنی کھیتیوں کا مربی سمجھنا غلط ہے اس لئے کہ خود آفتاب و ماہتاب اور ان کے نور کو اسی رب العالمین نے پیدا کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا — وہی جس نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا۔

اگر وہ رب العالمین آفتاب کو ضیاء اور ماہتاب کو نور نہ عطا فرماتا تو پھر آفتاب و ماہتاب کس طرح کھیتیاں پکا سکتے۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ وَرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔

حضرات صوفیۂ کرام قدس اللہ اسرارہم فرماتے ہیں کہ ارواح کے کانوں میں سب سے پہلے وصف ربوبیت ہی کا نغمۂ دلفزا پہونچا ہے اور پہلے اسی وصف سے انھوں نے خدا کو پہچانا ہے۔ كما قال تعالىٰ

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ — جب اللہ نے اولاد آدم کی پیٹھوں سے انکی ذریت کو نکالا اور ان کے اوپر خود ان ہی کو گواہ بنایا، پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ ان سب نے کہا ہاں۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے سب سے پہلے اسی اسم رب کے ساتھ ارواح کو مخاطب کیا اور اسی نام سے ان سے

عہد اور میثاق لیا۔ بظاہر یہی وجہ ہوگی کہ سب سے پہلے نبی یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک انبیاء و مرسلین اور عباد صالحین کی جو دعائیں حق تعالیٰ جل شانہ نے قرآن کریم میں ذکر فرمائی ہیں وہ اکثر و بیشتر کلمہ رَبَّنَا سے وارد ہوئی ہیں اور ایک مقام پر (رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا الخ) کلمہ رَبَّنَا سے دعا کرنے والوں کو اولوالالباب فرمایا ہے۔

(۳) عالم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے خالق کا علم حاصل ہوتا ہو۔ عالم علامت سے مشتق ہے۔ عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ علامت ہے اسماء الٰہی اور صفات خداوندی کی۔ عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کے کسی اسم کا مظہر اور آئینہ ہے۔ مومن و کافر اسکی شان انعام اور انتقام کے مظہر ہیں۔ صاحب عزت اور صاحب ذلت اسکی شان تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ کی تجلی گاہ ہیں۔ عالم غیب اور عالم شہادۃ اوس کے نام نامی ہو الظاہر و الباطن کے لئے آئینہ ہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مہربان، رحم کرنے والا

عجب نہیں کہ بسم اللہ میں وہ شان رحمت مراد ہو جو تکوین اور تربیت عالم کے لیے باعث ہوئی۔ اور سورۂ فاتحہ میں الرحمٰن سے وہ رحمت مراد ہو جو خاص حالت تربیت میں مبذول ہوتی ہے۔ اگر یہ رحمت روک لی جائے تو تربیت اور پرورش ناممکن ہو جائے۔ اور الرحیم سے وہ رحمت مراد ہو، جو تربیت اور پرورش کے بعد جزاء اور سزا کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اسلیئے کہ تربیت اور تکمیل کے بعد آثار اور ثمرات کا نہ مرتب ہونا اس تربیت کے ضائع کرنے کے مرادف ہے۔ کھیتی پکجانے کے بعد اگر اس پر درانتی نہ چلائی، گندم اور بھوسہ الگ الگ نہ کیا، تو گویا اس کھیتی کو ضائع کر دیا۔ اسی طرح اگر اس عالم کی تربیت ختم ہوجانے کے بعد مومن اور کافر، سعید اور شقی کو جدا جدا نہ کیا جائے تو عالم کی تربیت کا ضائع اور بیکار ہونا لازم آئے گا۔ آئندہ آیت یعنی مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی تکرار اسکی رحمت کے مکرر اور مضاعف ہونے کی طرف مشیر ہے، لیکن اس لیے کہ رحمت کی یہ فراوانی کہیں بندوں کو مغرور نہ بنا دے، مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کا اضافہ فرمایا۔ تاکہ رغبت کے ساتھ رہبت کا ضروری ہونا معلوم ہوجائے۔ جیسے غافر الذنب وقابل التوب کے بعد شدید العقاب کی صفت کو ذکر فرمایا"۔

عجب نہیں کہ الرحمٰن الرحیم کا مالک یوم الدین سے پہلے ذکر کرنا سبقت رحمتی علی غضبی کی جانب مشیر ہو۔

مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ

روز جزا کا مالک

بعض قراتوں میں مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ آیا ہے یعنی روز جزا کا بادشاہ۔ مالکیت اور ملکیت کے لیے یوم جزا کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اسکے جلال وجمال کا علی وجہ الاتم ظہور عالم کے ہر فرد کے لیے آن واحد میں اسی روز ہوگا۔ باقی

حاملانِ قرآن

شیخ محمد افضل عمادی

(۳)

(از مولوی محمد عثمان صاحب عمادی بی ایس سی (علیگ)

بیا بحضرتِ قرآں کہ دولتے است عظیم
فروغِ سلطنتش از صفا بہشت نعیم

وقار و جاہ گدایانِ درگہش بنگر — شہانِ بے کمر و خسروانِ بے دیہیم
نظر بہ وحی ازل گوش بر حدیث نبی — قدح کشند زصہبائے کوثر و تسنیم

شراب لعل لبش خور کہ لطف اوست غفور
مے طہور بپیما کہ فیض اوست کریم

تزکیۃ النفس صوبہ بہار کے ایک بزرگ (شمس الہدیٰ) دست بوسی کو حاضر ہوئے، یہ نام اتنا روشن تھا کہ حاضرین کے چہرے چمک اٹھے اور امنگیں بڑھ گئیں کہ اولاد کے نام رکھیں تو ایسے ہی رکھیں۔ فرمایا۔ بلکہ نام رکھیں تو ایسے نہ رکھیں، یہ سچ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو احب الاسماء عند اللہ محبوب تھے، اور یہ بھی جھوٹ نہیں کہ جن کا نام "رحمٰن" ہوتا تفاؤل خیر کے لیے اسکو "مہل" سے مخاطب فرماتے، تاہم ایسے اسماء جن میں اطرا ہو یا اترانے کی ادا ہو محبوب الی اللہ نہیں ہو سکتے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۔	کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے آپکو بڑھاتے ہیں، اپنا تزکیہ اور اپنی تعریف آپ ہی کرتے ہیں، بڑھانا اور

قابل تعریف و تزکیہ بنانا تو اللہ ہی کی شان ہی جسے چاہے اس مرتبہ پر فائز کرے، اللہ کی جناب میں لوگوں کو بقدر کھجور کی گٹھلی کے ایک ریشہ کے بھی نقصان اٹھانا نہ پڑے گا۔

مفسرین لکھتے ہیں :۔

ویدخل فی ھذا التلقب بالالقاب المتضمنۃ للتزکیۃ کمحی الدین وعز الدین وسلطان العارفین ونحوھا ۔	اسی حکم میں وہ لقب بھی داخل ہیں جن سے اپنی تعریف نکلتی ہو مثلاً محی الدین (دین اسلام کو زندہ کرنے والا) عز الدین (دین اسلام کی عزت)، سلطان العارفین (عارفان خدا کا بادشاہ) وغیرہ ۔

غرض کی اس آیت سے تو یہود یا نصاریٰ مراد ہیں، حسن کی روایت میں یہودیوں کا دعویٰ تھا :۔

نَحْنُ اَبْنٰۗؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ	ہم ہیں اللہ کی اولاد و احباب

قتادہ کی روایت میں ان مدعیوں کا اصرار تھا کہ :۔

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى	بجز ان کے جو یہودی یا نصرانی ہوں بہشت میں ہرگز کوئی اور داخل نہ ہو گا ۔

ضحاک کی روایت میں ان کو یہ بھی ادعا تھا کہ :۔

لاذنوب لنا ونحن کالاطفال وان آباءنا یشفعون لنا	ہمیں گناہ سے کیا سروکار، ہم تو بچوں کی طرح معصوم ہیں ہمارے باپ دادا ہماری شفاعت کریں گے اور ہمیں عذاب سے بچالیں گے ۔

فرمایا۔ اللفظ یتناول کل من زکی نفسہ۔ لفظ عام ہے، جو کوئی اپنا تزکیہ کرے، حق ہو یا باطل،

بحق او بباطل من الیھود وغیرھم وکل من	یہودی ہوں یا اور کوئی، یہ لفظ سب پر شامل ہے جنہو

ذکو انفسہم بصلاح او وصفها بزکاء العمل او بزیادة الطاعة والتقوی او بزیادة الزلفی عند الله

اپنی صلاحیت بیان کی یا اپنے اعمال کے بڑھنے، یا کثرت عبادت وتقویٰ، یا جناب الٰہی میں زیادہ مقرب ہونے کا دعویٰ کیا، ایسے تمام لوگ اس مفہوم میں شامل ہیں۔

رویت | عرض کی: "اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ"، میں رویت یعنی دیکھنے کا مفہوم ہی رویت بالعین ہی ہوتی ہے، آنکھ ہی سے دیکھ سکتے ہیں، حدیث میں ہے:-

ستروں ربکم کما ترون القمر لیلة البدر لا تضامون فی رویته

عنقریب تمہیں اپنے پروردگار کی رویت اسطرح حاصل ہوگی جیسے کہ چودھویں رات میں چاند کو دیکھتے ہو تم اسے بے تکلف دیکھ لوگے۔

اس بنا پر "الم تر" (کیا تو نے نہیں دیکھا؟) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا مقصود ہی، اور جب یہ صورت ہو تو حضرت سے قبل وبعد والوں کے متعلق کوئی حکم اس آیت سے استنباط نہ ہوگا۔

رویت بالعین | فرمایا:- رویت کا تعلق آنکھوں سے بھی ہے، اور یہ متعارف ہے۔

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ؟ — کیا تو نے اسکو نہیں دیکھا جو دین کو جھٹلاتا ہے؟

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی؟ — کیا تو نے اسے نہیں دیکھا جو بندہ کو نماز سے روکتا ہے؟

ان سب میں رویت بالعین ہے اور اسکی مثالیں بے پایاں متداول ہیں:-

رویت بالقلب | رویت کی دوسری قسم رویت بالقلب ہے جو مفید علم ہوتی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ، اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔

وہ کہ اللہ نے اسے ملک دیا تھا کیا تو نے اسکو نہیں دیکھا کہ ابراہیم سے پروردگار ابراہیم کے باب میں حجت کی، ابراہیم نے جب کہا کہ میرا پروردگار تو ہے جو مردہ کو زندہ کرتا ہے اور زندہ کو مار ڈالتا ہے اس نے کہا میں زندہ کرنے اور مار ڈالنے پر قادر ہوں، ابراہیم نے کہا اللہ تو وہ ہے کہ آفتاب کو مشرق سے لاتا ہے، تجھے خدائی کا دعویٰ ہو تو آفتاب کو مغرب سے لا، یہ سن کے کافر مبہوت ہو گیا۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہاں "الم تر" میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہی، یعنی اے پیغمبر کیا آپ نے نہیں دیکھا، مگر جس واقعہ کے دیکھنے کے لیے مخاطب فرمایا ہے وہ پیش نظر نہیں ہی، بلکہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات ہی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت پہلے تھے، اس لیے لامحالہ یہ رویت بالقلب ہوگی۔

رویت بالاعتقاد تیسری قسم کی رویت رہی جو اعتقاد پر مبنی ہو، اللہ اپنے پیغمبر سے خطاب کرتا ہے :۔

لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّٰهُ۔ — تاکہ اللہ نے تجھ جو دکھایا ہے اسی کے مطابق لوگوں کے درمیان تو فیصلہ کرے

یہاں "دکھانے" سے اعتقاد ہی مراد ہے، حس بصر مراد نہیں، اسی طرح "اراک اللہ" کے معنی "اعلمک اللہ" بھی نہیں ہو سکتے، کیونکہ اس صورت میں از روئے قاعدہ متعدی بسہ مفعول ہونا لازم تھا اور یہاں متعدی بدو مفعول سے زائد نہیں

رویت بالظن حدیث میں ہے :۔

اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم بدءَ بالصلاۃ قبل الخطبۃ یوم العید ثم خطب فرأی انہ لم یسمع النساء فاتاھن ووعظھن۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کے دن خطبہ عید سے پہلے نماز عید شروع کی، نماز ہو چکی تو خطبہ فرمایا، ایسا دکھائی دیا کہ عورتیں یہ خطبہ نہ سن سکیں، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام عورتوں کے پاس آئے اور ان کو وعظ سنایا۔

"رأی" (دکھائی دیا) یعنی گمان ہوا، یہاں بھی رویت متعلق بحس بصر نہیں بلکہ نظر بظن ورد ہس ہے، اور اس معنی میں محدثین کے ساتھ لغویین بھی ہمداستان ہیں۔

رؤیا غرض کہ رویت ہی کے اخوات میں رؤیا بھی ہے جس کے معنی خواب کے ہیں۔

یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ — اے میرے بیٹے اپنے رؤیا (خواب) کا قصہ اپنے بھائیوں سے نہ کہنا

ایک دوسری آیت میں ہے :۔

اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّؤْیَا تَعْبُرُوْنَ ؟ — اگر تم لوگ رؤیا (خواب) کی تعبیر کرتے ہو ؟

اس ذیل میں حل طلب مشکل یہ ہے کہ حدیث معراج سے مترشح ہوتا ہے کہ معراج کے مشاہدات بھی رؤیا سے وابستہ تھے۔

معراج بہ بیداری | فرمایا۔ رویا کے ایک معنی رویت کے بھی ہیں یعنی بیداری میں آنکھ سے دیکھنا، راعی کہتا ہے :۔

فکبر للرویا وھش فوادہ — وبشر نفسا کان قبل یلومھا

فکبر للرویا اے للرویۃ متنبی کہتا ہے :۔

ورؤیاک احلی فی العیون من الغمض

رؤیاک اے رویتک۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :۔

وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس — اور جو رویا ہم نے تجھے دکھایا اسکو لوگوں کے لیے محض ایک فتنہ اور آزمایش بنایا۔

تمام مفسرین نے یہاں رویا کے معنی رویت ہی کے لیے ہیں یعنی رویت فی الیقظۃ لا بالمنام۔ اس موقع پر مجھ اپنے عزیز بھائی مولوی سعید الحق عمادی بی اے کا ایک شعر یاد آیا جو معراج کے متعلق صاحب معراج سے خطاب ہے۔ کہتے ہیں ؎

اے رفتہ فراز عرش بر حالت مارحمے — معراج بہ بیداری اسلام بخواب اندر

مصداق صلاۃ | غیر انبیاء بھی مستحق صلاۃ ہیں یا نہیں، اسکی بحث چھڑی ہوئی تھی، موالف و مخالف اپنے اپنے شواہد پیش کر رہے تھے، مجال کلام کو وسیع ہوتے دیکھ کر فرمایا :۔ "صلاۃ" کے اصلی معنی "لزوم" کے ہیں، یقال قد صلی واصطلی، ومن ہذا من یصلی فی النار اے یلزم النار۔ ابن ابی اوفی کی روایت میں ہے :۔

اعطانی ابی صدقۃ مالہ فاتیت بھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فقال اللھم صل علی آل ابی اوفی۔ — میرے والد نے اپنے مال کی زکوٰۃ دی کہ بارگاہ نبوی میں پیش ہو، میں اسے لے کر آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جناب میں حاضر ہوا، حضرت نے فرمایا اللھم صل علی آل ابی اوفی یعنی اے میرے اللہ ابو اوفی کی آل اولاد پر صلوٰۃ بھیج۔

راعی کہتا ہے :۔

صلی علی عزۃ الرحمن وابنتہا لیلی وصلی علی جاراتہا الاخر

عدی بن رقاع کہتا ہے :-

صلی الالہ علی امرء ودعتہ واتم نعمتہ علیہ وزادھا

صدر اسلام میں یہی تعامل تھا، بعد کو تہذیب نے تخصیص کر دی کہ صرف انبیاء علیہم السلام اور خصوصاً حضرت سید الانبیاء صلواۃ اللہ علیہ ہی صلوٰۃ کا استحقاق رکھتے ہیں کہ حفظ مراتب وفرق مدارج کا لحاظ قائم رہے۔

دعائے خیر | صلوٰۃ جنازہ بھی صلوٰۃ ہے، مگر نماز نہیں، اس پر مکالمہ شروع ہوگیا، ہر ایک کی توجہ کسی نکتہ کی طرف تھی۔ فرمایا: صلوٰۃ کے معنی دعائے خیر کے بھی ہیں، حدیث میں ہے :-

اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب فان کان مفطرا فلیطعم وان کان صائما فلیصل

تم میں سے کوئی شخص کھانا کھانے کے لئے بلایا جائے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے، اگر بحالت افطار ہو تو کھالے اور اگر روزہ دار ہو تو صلوٰۃ بھیجے۔

صلوٰۃ بھیجنے کے معنی محدثین نے دعا کرنے کے لکھے ہیں، یعنی کھلانے والوں کو خیر وبرکت کی دعا دے۔ اعشیٰ کہتا ہے

وصہباء طاف یہودیہا وابرزہا وعلیہا ختم

وقابلہا الریح فی دنہا وصلی علی دنہا وارتسم

صلی علی دنہا، شراب کے مٹکے پر صلوٰۃ بھیجی، یعنی دعا کی کہ شراب بگڑنے نہ پائے اور ذائقہ میں ترشی نہ آجائے۔

(۳) اعشیٰ نے ایک اور قصیدہ میں ایک عورت سے خطاب کیا ہے :-

علیک مثل الذی صلیت فاغتمضی نوما فان لجنب المرء مضطجعا

یعنی جیسی صلوٰۃ تو نے مجھ پر بھیجی ہے ویسی ہی صلوٰۃ تجھ پر بھی پہونچے، تو نے مجھے دعا دی، میں تجھے خیر وبرکت کی دعا دیتا ہوں۔

استغفار | صلوٰۃ کے ایک معنی استغفار کے بھی ہیں، ام المومنین سودہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے :-

قالت یا رسول اللہ اذا متنا صلی لنا عثمان بن مظعون حتی تاتینا فقال لها ان الموت اشد مما تقدرین سودہ نے عرض کی یا رسول اللہ کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ ہم مر گئے تو جب تک آپ نہ آئیں عثمان بن مظعون اس وقت تک ہم پر صلاۃ بھیجیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ اے سودہ موت تمہارے اندازہ سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

یہاں صلاۃ کے معنی استغفار کے ہیں، یعنی عثمان بن مظعون ؓ ہمارے لیے جناب الٰہی سے مغفرت و بخشایش طلب کرتے ہیں۔

ترحم | صلوٰۃ کے معنی ترحم کے بھی ہیں، کلام اللہ میں ہے:۔ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ صلوٰۃ جب اللہ کی جانب سے ہو تو اسکے معنی رحمت کے ہونگے، فرشتوں کی صلاۃ دعاء و استغفار ہے۔ وبہ سمیت الصلاۃ لما فیہا من الدعاء والاستغفار۔ صلاۃ (نماز) کا نام صلاۃ اسی لیے پڑا کہ اس میں دعاء و استغفار ہے۔

حسن ثنا | صلاۃ کے ایک معنی ثنا و ستایش کے بھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک بندوں کو بشارت دی ہے:۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ "یہ لوگ ہیں کہ ان کے پروردگار کی جناب سے ان پر صلوٰۃ اور رحمت ہوگی" صلوٰۃ ہوگی یعنی اللہ انکی ثنا کرے گا۔

عبادت گاہ یہود | صلوٰۃ کے ایک معنی یہودیوں کی عبادتگاہ کے بھی ہیں، عبرانی زبان میں صلاۃ کو صلوتا کہتے ہیں عربی اور عبرانی میں اتنا فرق ہے کہ یہاں اگر صلاۃ کے معنی دعا کے ہیں تو وہاں صلوتا کے معنی محل دعا کے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ، یہاں صلوات کے معنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہود کے کنیسے بتائے ہیں۔

صلاۃ بالجمر | گوشت کو آگ میں ڈالدینے کو بھی صلاۃ کہتے ہیں جس سے جلانا مقصود ہوتا ہے۔

الا یا اسلمی یا ھند ھند بنی بدر ... تحیۃ من صلی فوادک بالجمر

صلاۃ الید | ہاتھ کو آگ سے گرم رکھنا بھی صلاۃ ہے۔ آتانا فلم نفرح بطلعۃ وجھہ ::: طروقا و صلی کف اشعث سافب

صلاۃ عصا | چھڑی کو آنچ دکھانا کہ گرم ہو کر سیدھی ہو جائے بھی صلاۃ ہے۔ قیس بن زہیر کہتا ہے۔

فلا تعجل بامرک واستدمہ ... فما صلی عصاہ کمستدیم

مصلی | جس طرح نمازی کو مصلی کہتے ہیں اسی طرح گھڑدوڑ میں جو گھوڑا دوسرے نمبر پر آئے وہ بھی مصلی ہے اول نمبر پر آنے والا سابق ہے۔ امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب ؓ فرماتے ہیں:۔ سبق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصلی ابوبکر وثلث عمر وخبطتنا فتنۃ فما شاء اللہ۔ رسول اللہ سابق ہوئے، ابوبکر ؓ مصلی ہوئے، عمر ؓ نے تیسرے درجہ کی کامیابی حاصل کی، پھر فتنہ نے ہمکو درہم برہم کر دیا، اب جو اللہ چاہے۔۔

رسائل و مسائل

مولٰنا اسلم جیراج پوری کے جواب پر ایک نظر

(اشاعت گزشتہ میں جناب مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراج پوری کا وہ مضمون درج کیا جا چکا ہے جو انھوں نے "تفہیمات قرآن" پر میرے تبصرے کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کے سبب سے میرا جواب الجواب ساتھ ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ ناظرین اس کو ملاحظہ فرماتے وقت مولانا کے مضمون کو پیش نظر رکھیں تو سمجھنے میں آسانی ہو گی)

یہ بات پہلے ہی صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں عام مسلمانوں کے کسی ایسے عقیدہ کا معتقد نہیں ہوں جس کا ثبوت کتاب و سنت میں نہ ہو۔ ایسے تمام عقائد کے خلاف "صدائے احتجاج" بلند کرنے میں آپ کے ساتھ میں بھی شریک ہوں۔ مگر جن باتوں کا ثبوت کتاب اللہ و سنت رسول میں موجود ہو، ان کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کی جائیگی، اسکی تائید کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے، بلکہ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آپنے جو عبارتیں اپنی طرف سے کتاب کے متن یا حاشیہ میں تفسیر و تشریح کے طور پر لکھی ہیں ان کے متعلق میں نے آپ کی اس تصریح کا احترام ملحوظ رکھا ہے کہ آپ کو ان پر اصرار نہیں ہے، اور یہ کہ آپ "انکو اتنی وقعت

بھی نہیں دیتے کہ کوئی صاحب ان پر اعتراض کی زحمت گوارا کریں،، لیکن جب آپ کسی آیت کی متعدد احتمالی تاویلات میں سے کسی ایک تاویل کو بیان فرمائیں گے اور اسکی تائید میں دلائل پیش کریں گے، تو میں یہ سمجھنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گا کہ آپکے نزدیک وہی تاویل راجح ہے، اور اگر میرے نزدیک آپ کی ترجیح درست نہ ہو، اور اس کے بجائے کسی دوسری تاویل کے حق میں مجھ کو زیادہ قوی دلائل نظر آئیں، تو مجھے حق ہونا چاہیئے کہ آپکی ترجیح پر اعتراض کروں اور اس دوسری تاویل کی تائید کروں۔ آپ نے اپنی رائے ظاہر کر کے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والوں کو غور و فکر کا ایک راستہ دکھایا ہے۔ میں اس رہنمائی میں کہیں کہیں غلطی محسوس کرتا ہوں، اور یہ بتادینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ راستہ جو دکھایا گیا ہے، سیدھا راستہ نہیں ہے۔ اگر آپ اس راستہ کی استقامت ثابت کردیں گے تو میں مان لوں گا۔ اور اگر میں اسکی غلطی ثابت کر دوں تو آپ مان لیجئے۔ بحث کا مدار انشاء اللہ قرآن مجید ہی رہے گا۔ اس سے باہر نہ آپ جائیے اور نہ میں جاؤں گا۔

جن و انس جن و انس کے متعلق قرآن میں ایسی کوئی تصریح مجھے نہیں ملی جس سے یہ شبہ بھی کیا جا سکے کہ جہاں کہیں جن و انس کے الفاظ ساتھ ساتھ آتے ہیں وہاں جن کے معنی آتشیں جن کے نہیں ہیں بلکہ انسانوں ہی کے ایک طبقہ کے ہیں۔ جو شیاطین اور جن حضرت سلیمان کے تابع تھے ان پر انسان ہونے کا گمان آپ نے اس بنا پر کیا ہے کہ:۔

> اولاً وہ نظر آتے تھے اور انسانوں کے سے کام کرتے تھے مثلاً معماری، غوطہ خوری ظروف سازی وغیرہ
>
> ثانیاً تاریخ اور "توریت" وغیرہ سے آپ کو ان مزدوروں کا حال معلوم ہو چکا ہے جو حضرت سلیمان نے مصر سے بلوائے تھے۔

لیکن پہلی وجہ اس طرح دور ہو جاتی ہے کہ غیر مادی مخلوقات کو خواہ وہ نوری ہوں یا ناری، اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت عطا فرمائی ہے کہ وہ بشری شکل میں متمثل ہوں، اور مرئی و محسوس بن جائیں۔ چنانچہ سورۂ **ھود** کے ساتویں رکوع میں ذکر ہے کہ فرشتے حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام کے سامنے بشری

شکل میں آئے۔ اور حضرت لوط کی قوم نے ان کو کم سن نوجوانوں کی شکل میں دیکھا۔ اور سورۂ مریم کے دوسرے رکوع میں بیان ہوا ہے کہ فرشتہ حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے انسانی شکل میں متمثل ہوا اور اس نے آپ سے کلام کیا۔ جنگ بدر اور اُحد میں فرشتوں کی شرکت کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے، حتیٰ کہ انہی کی شرکت کی وجہ سے مسلمان کافروں کو اپنے سے دوچند نظر آنے لگے۔ ان مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آتشیں جنوں اور شیاطین کا مرئی و محسوس بن جانا اور انسانوں کے سے کام کرنا مستبعد نہیں ہے۔

رہی دوسری وجہ تو مجھے تعجب ہے کہ آپ قرآن کی تفسیر قرآن سے کرنے کا دعویٰ بھی فرماتے ہیں اور قرآن کے معانی متعین کرنے کے لیئے قرآن سے باہر بھی جاتے ہیں۔ پھر قرآن سے باہر بھی آپ گئے تو کہاں؟ تاریخ میں جو کم از کم حدیث سے تو بہت زیادہ غیر یقینی چیز ہے۔ اور توریت میں جس کا محرّف ہونا تمام اہل قرآن کے نزدیک مسلّم ہے۔ آپ نے خود قرآن سے کیوں نہ پوچھا کہ حضرت سلیمان کے پاس جو جن اور شیاطین تھے وہ کس قسم کے تھے؟

قرآن میں بیان ہوا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے خدا سے دعا کی تھی کہ مجھ کو ایسی سلطنت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو سزاوار نہ ہو۔ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي۔ اس دعا کو قبول کیا گیا اور اس شکل میں قبول کیا گیا کہ ہوا اُن کے تابع کر دی گئی۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ۔ شیاطین (یا جن) ان کے بس میں کر دیئے گئے وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ (۳۸ : ۳۰) ان کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی اور ان کے لشکر میں پرندے شامل کیے گئے۔ قَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ .... وَحُشِرَ لِسُلَيْمَانَ جُنُودُهُ مِنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ وَالطَّيْرِ (۲۷ : ۲) نہ صرف پرند بلکہ دوسرے جانوروں کی بولیاں بھی ان کو سکھائی گئیں جیسا کہ سورۂ نمل میں ارشاد ہوا ہے کہ جب سلیمان ؑ کا لشکر وادی النمل میں پہنچا تو ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے کہا کہ اپنے بلوں میں گھس جاؤ کہیں سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل نہ ڈالیں۔ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ۔ یہ قول حضرت سلیمان نے سن لیا اور وہ اس کو سمجھ کر ہنس دیئے فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّن قَوْلِهَا (۲۷ : ۲) یہ سب باتیں اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت سلیمان کو ان کی دعا کے جواب میں

جو چیزیں دی گئی تھیں وہ غیر معمولی تھیں، اور ان کے بعد کسی اور کو عطا نہیں ہوئیں۔ اگر شیاطین اور جنوں سے مراد ایسے آدمی لیئے جائیں جو غوطے لگانے والے، اور برتن اور عمارتیں بنانے والے ہوں، تو اس میں کوئی بات غیر معمولی نہ ہوتی، اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت سلیمان کے بعد ایسے آدمی کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ بلکہ اگر آپ کے ارشاد کے مطابق "تاریخ اور خود توریت" کی شہادت مان لی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ غوطہ خور اور معمار تو خود حضرت سلیمان کے عہد میں مصر کے بادشاہ کو حاصل تھے اور حضرت سلیمان نے ان کو شاہ مصر سے درخواست کر کے، نہ کہ خدا سے دعا کر کے حاصل کیا تھا۔

تاہم اگر اب بھی آپ کو ان شیاطین اور جنوں کے آتشیں شیاطین اور جن ہونے میں شک ہے تو سورہ نمل کا تیسرا رکوع ملاحظہ فرمایئے۔ قرآن مجید خود آپ کا شک رفع کر دیگا۔ جب حضرت سلیمان کے پاس ملکہ سبا کا جواب پہنچا ہے تو آپ اہل دربار سے خطاب کر کے پوچھتے ہیں۔ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ۔ تم میں کون ہے جو ملکہ سبا کا تخت میرے پاس اٹھالائے، قبل اس کے کہ اہل سبا میرے پاس مطیع ہو کر آئیں؟ اس پر جنوں میں سے ایک عفریت کہتا ہے کہ میں اسکو لے آؤں گا قبل اسکے کہ آپ اپنے مقام سے اٹھیں۔ قَالَ عِفْرِيتٌ مِّنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَّقَامِكَ اس بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن جس نے یہ دعویٰ کیا تھا، آتشیں جن ہی تھا۔ کیونکہ کوئی انسان اسپر قادر نہیں ہے کہ جنوب عرب سے کوئی چیز فلسطین تک چند ساعتوں میں اٹھالے جائے۔

مفہوم خلافت | خلافت آدم کے متعلق قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں"، آپ فرماتے ہیں کہ یہاں "خلیفہ" سے مراد پرانے ساکنین ارض کا خلیفہ ہے اور اس کے سوا اس آیت کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہے لیکن اس معنی پر اصرار، اور دوسرے معنی کے احتمال سے انکار کیلئے آپکے پاس کوئی قرآنی دلیل نہیں ہے، اس لئے آپ نے یہ خیالی دلیل پیش فرمائی ہے کہ آدم کو خلیفۃ حق قرار دینے میں حق تعالیٰ کی کسر شان ہے، اور یہ کہ بغدادیوں کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ "خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ کے

الفاظ وہ سانچے ہیں جن میں انھوں نے استبداد کے بت دینی روپ میں ڈھالے تھے، لیکن مجھے قرآن کے معانی متعین کرنے کے لیئے قرآن سے باہر جانے اور بغدادیوں کی تاریخ یا تخیل کی دنیا میں سند تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود قرآن ہی میں ایسے اشارات پاتا ہوں جن سے خلافت کی یہ تاویل راجح قرار پاتی ہے کہ اس سے مراد حق تعالیٰ ہی کی خلافت ہے۔ اس کے لیے آیات ذیل ملاحظہ ہوں:-

قَالَ عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّھْلِکَ عَدُوَّکُمْ وَیَسْتَخْلِفَکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ (۷: ۱۵)	موسیٰ نے کہا کہ قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین میں تم کو خلیفہ بنائے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو
وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَیْئًا (۱۱: ۵)	اور میرا رب تمہارے سوا دوسری قوم کو خلیفہ بنالیگا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکوگے۔
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ (۲۴: ۷)	تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیئے ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انکو زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح اس نے ان لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔

ان تمام آیتوں میں لفظ "استخلاف" وارد ہوا ہے جس کے معنی آپ کو لغت کی ہر کتاب میں اپنا خلیفہ بنانے کے ملیں گے۔ استخلفہ ای جعلہ خلیفۃ لہ۔ اسکی تائید ایک دوسری آیت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت داؤد سے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ (۳۸: ۲) "ہم نے تجھ کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے"، اس میں کوئی اشارہ اس طرف نہیں ہے کہ ہم نے تجھ کو پہلے بادشاہوں کی جگہ مقرر کیا ہے۔ اگر یہ کہنا مقصود ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ انا جعلنٰک فی الارض خلیفۃ للذین کانوا من قبلک۔ پس جب منوب عنہ کا ذکر نہیں ہے، اور نائب بنانے کا ذکر ہے تو معنی یہی ہونگے کہ نائب اسی کا ہے

جس نے اسکو نائب مقرر کیا ہے۔ یہ کہنا کہ "میں نے تم کو فلاں شخص کا نائب مقرر کیا"، اور معنی رکھتا ہے، اور یہ کہنا کہ "میں نے تم کو نائب مقرر کیا"، دوسرے معنی ظاہر کرتا ہے۔ دونوں کا فرق اتنا نازک نہیں ہے کہ تھوڑے سے تامل سے واضح نہ ہو جائے۔

آپ کو نیابتِ حق کی تاویل قبول کرنے میں اس لیے تامل ہے کہ اس میں حق تعالیٰ کی کسرِ شان ہے اور وہ نائب کا محتاج ٹھیرتا ہے۔ لیکن یہ شبہ نیابت کے مفہوم پر غور نہ کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ نیابت کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ منوب عنہ حاضر نہ ہو، یا مر گیا ہو یا عاجز ہو۔ بلکہ کسی ماتحت کا درجہ بڑھانے اور اسکو عزو شرف بخشنے کے لیے بھی نائب کے مرتبہ سے سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسان کو حق تعالیٰ نے علم و ادراک، تمیز و اختیار، قدرت و ارادہ، اور تصرف فی الاشیاء کی وہ قوتیں عطا فرمائی تھیں جو کائنات ارض کی کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کیں، اور زمین میں جو کچھ تھا اسی کے لیے پیدا کیا تھا (خلق لکم ما فی الارض جمیعاً ۲ : ۳) اور زمین و آسمان کی تمام قوتیں اس کے لیے مسخر کر دی تھیں (وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ۴۵ : ۲) اور دنیا میں حضرت حق کے بعد اور کوئی موجود انسان سے اشرف نہ تھا۔ اسلیئے انسان کو نائب کے خطاب سے سرفراز فرمایا، تاکہ ایک طرف اس کے شرف کا اظہار ہو اور دوسری طرف خود اس میں اپنے مرتبہ کی بلندی کے ساتھ اپنی اخلاقی ذمہ داریوں کا بھی احساس پیدا ہو، وہ خدا کے سوا کسی کے آگے نہ جھکے، اور خدا کی بخشی ہوئی چیزوں میں تصرف کرتے وقت یہ یاد رکھے کہ وہ ان چیزوں کا مالک نہیں ہے بلکہ اصل مالک کا نائب ہے، اور اصل مالک کی رضا اور اس کے مقرر کیے ہوئے قوانین کے خلاف تصرف کرنے کا اسکو حق نہیں ہے۔ نیابت حق کے تصور میں یہی وہ معنوی حقیقتیں ہیں جن کو آپ "شاعری" قرار دیتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ "بغدادیوں" نے خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ کے الفاظ کو ان کے اصل مفہوم سے پھیر کر، ان کی اسپرٹ کے خلاف ظلم و استبداد کے لیئے استعمال کیا، تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ قرآن کے معانی

کی تعیین میں کسی بغدادی یا کسی دمشقی کے قول کا کیا دخل ہے؟ بغداد والوں نے تو اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کے سانچے میں بھی استبداد کے بت ڈھالے تھے، وَالْفِتْنَۃُ اَکْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ کو بھی ظلم کے لئے استعمال کیا تھا۔ پھر کیا آپ ان سب سانچوں کو توڑ دیں گے جن میں ظالموں نے اپنی سرکشی سے استبداد کے بت ڈھالے تھے؟ آپ قرآن کی تفسیر قرآن سے کر رہے ہیں یا بغداد و دمشق کی تاریخ سے؟

آدم کا گناہ

آدم علیہ السلام کے متعلق "ساری دنیا" جو کچھ کہتی ہے اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں مجھے صرف اس سے بحث ہے کہ قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کا ارشاد ہے کہ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ (پھر اس کے رب نے اسکو برگزیدہ کیا اور اسکی توبہ قبول کر لی)۔ آپ فرماتے ہیں کہ قبول توبہ اور عفو ومغفرت میں فرق ہے۔ مگر میں قرآن سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھیے ارشاد ہوتا ہے کہ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۵:۶) یہاں یتوب علیہ کے معنی پر ان اللہ غفور رحیم کا فقرہ روشنی ڈال رہا ہے اگر یہاں قبول توبہ کے معنی معاف کر دینے اور بخش دینے کے نہیں ہیں تو کیا اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جو ظلم کرنے کے بعد توبہ کرے گا اور نیکوکار بن جائے گا، اللہ اسکی توبہ قبول کر لے گا مگر اسے معاف نہیں کرے گا؟ ایک دوسری جگہ حق تعالیٰ بنی اسرائیل کو اپنے احسانات یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب تم نے بچھڑے کی پرستش کرنے کے بعد موسیٰ کے کہنے سے توبہ کی تو ہم نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۲:۶) کیا اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی مگر تمہیں معاف نہیں کیا؟ اگر یہی مفہوم ہے تو پھر احسان کس چیز کا جتایا گیا ہے؟ ایک اور جگہ ارشاد ہوا ہے کہ تم روزوں کی راتوں میں چھپ چھپ کر اپنی بیویوں سے مباشرت کرتے تھے۔ اللہ کو تمہاری اس حرکت کا علم ہے مگر اس نے تمہیں معاف کر دیا۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ (۲:۲۳) یہاں عفا عنکم کے الفاظ تاب علیکم کی تفسیر کر رہے ہیں۔ سورہ نساء میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ نادانی سے برا فعل کرتے ہیں پھر جلدی

سے توبہ کر لیتے ہیں۔ اللہ انکی توبہ قبول کر لیتا ہے - ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ (۴ : ۳) کیا اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اللہ ان کو معاف نہیں کرتا۔ صرف توبہ قبول کرتا ہے؟ سورۂ توبہ میں ہے کہ جن لوگوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا اور اچھے اور برے دونوں طرح کے عمل کیے، امید ہے کہ اللہ ان کو بھی بخش دیگا عسى اللّٰه ان يتوب عليهم ان اللّٰه عفور رحيم (۹ : ۱۳) کیا یہاں خدائے غفور و رحیم کی یہی شان بیان کی گئی ہے کہ وہ توبہ قبول کر لیتا ہے مگر بخشتا نہیں؟ سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم کی دعا کے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں :- وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (۲ : ۱۵) کیا اس دعا کا یہ مفہوم ہے کہ خدایا! تو ہماری توبہ قبول کر مگر ہمیں معاف نہ کر؟ ان تمام آیات میں خود قرآن مجید نے قبول توبہ اور عفو و مغفرت کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ پھر اس کتاب کے وہ کون سے حقائق ہیں جن کا سمجھنا "توبہ، مغفرت اور عفو وغیرہ" کے درمیان فرق کرنے پر موقوف ہے؟

آپ نے قبول توبہ اور مغفرت کا فرق صرف اس بات سے نکالا ہے کہ حضرت آدم کی توبہ قبول کرنے کے باوجود ان کو جنت سے نکالا گیا۔ اس شبہ کا ایک جواب میں اپنی تنقید میں پہلے ہی دے چکا ہوں مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس جواب سے آپ مطمئن نہیں ہوئے۔ اب میں ایک دوسرے پہلو سے اسکو دفع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس سے مطمئن ہو جائیں گے۔ قرآن مجید میں آدم علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں ان پر غور کیجیے۔ جنت کے قیام کی یہ کیفیت تھی کہ وہاں انسانی خواہشات اور حاجات نہ تھیں اور نہ بشری احساسات تھے (إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۲۰ : ۷) ان احساسات کا سرچشمہ وہ تھا جس کو قرآن نے "درخت" سے تعبیر کیا ہے۔ حضرت حق نے آدم اور انکی بیوی کو ہدایت فرمائی تھی کہ اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ تم اپنے اوپر آپ ظلم کرو گے (وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ۲ : ۴) شیطان نے ان کو دھوکہ دیا۔ اور کہا کہ تمہارے پروردگار نے تم کو اس درخت سے

اس لیئے منع کیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ اور تمہیں ہمیشہ کی زندگی نہ ملے (وَمَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۲:۷) آؤ میں تم کو بقائے دوام کے درخت کا مزا چکھاؤں (هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۲۰:۷) آدم اپنے اس دشمن کے دھوکے میں آگئے، اور وہ ان کو شجرۃ الخلد کے پاس لے جانے کے بجائے اس چیز کی طرف لے گیا جس کی خاصیت یہ تھی کہ انسان کی بشری کمزوریوں کو نمایاں کردے، اس میں وجی احساس (Sexal instinct) پیدا کردے، اسکو اپنے جسم کے ان مخصوص مقامات کا راز بتادے جو اس وقت تک اس سے چھپے ہوئے تھے، اور اس کے اندر وہ جذبات پیدا کردے جو آپس کی دشمنی کے لیئے محرک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس درخت کا مزا چکھتے ہی یہ سب خصوصیات نمایاں ہوگئیں اور بشری کمزوریوں پر جو پردہ پڑا ہوا تھا، یکایک اٹھ گیا (فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا .... فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۲:۷) جب یہ چیز پیدا ہوگئی تو آدم اور انکی بیوی کے اندر جنت میں رہنے کی صلاحیت باقی نہ رہی۔ ان خصوصیات کے نمایاں ہوجانے کے بعد ان کے لیئے زمین ہی مناسب جائے قیام تھی اس لیئے ان سے کہہ دیا گیا کہ اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَّلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲:۴) جاؤ اب زمین ہی تمہارے لیئے جائے قرار ہے جہاں تم ایک دوسرے کے دشمن ہوگے"۔ اب جنت تمہارا پیدائشی مقام نہیں رہا بلکہ اب جنت میں آنا تمہارے عمل پر موقوف ہوگا۔ جو ہماری بھیجی ہوئی ہدایت پر عمل کرے گا وہ جنت میں آئے گا اور جو نافرمانی کریگا وہ دوزخ میں جائے گا۔ (فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲:۴) یہ حکم سزا اور انتقام کے طور پر نہ تھا۔ بلکہ اس "شجر" کا مزا چکھنے کا طبیعی نتیجہ یہی تھا کہ آدم اور انکی بیوی قیام جنت کے قابل نہ رہیں اور زمین میں رہنے کے قابل ہوجائیں۔ آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور وہ قبول بھی ہوئی، مگر قبولِ توبہ کی صحیح صورت یہ نہ تھی کہ حق تعالیٰ

اپنی سنت کے خلاف ان کے فعل کے طبعی نتیجہ کو بدل دینا، بلکہ اسکی صحیح صورت یہ تھی کہ انھوں نے حکم خداوندی کے خلاف جو نافرمانی کی تھی اسکو معاف کر دیا گیا، وہ راندہ درگاہ ہونے کے بجائے برگزیدہ ہوئے اور ان کو راہ راست کی طرف ہدایت بخشی گئی (وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَیْهِ وَهَدٰی ۔ ۲۰: ۷) اس کی مثال ایسی ہی، جیسے کوئی شخص شراب پیئے اور شراب کے اثر سے اس کے اعضائے رئیسہ خراب ہو جائیں۔ پھر وہ توبہ کرلے حق تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اسکو معاف کر دیگا، مگر اس معافی کی صورت یہ نہ ہوگی کہ اس کے نظام جسمانی میں شراب کی طبعی تاثیر سے جو خرابی واقع ہو گئی ہے اسکو قبول توبہ کے ساتھ ہی دور کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کی صورت یہ ہوگی کہ ایک حرام اور ممنوع چیز استعمال کرنے کی پاداش میں اسپر جو عتاب ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوگا اور اس گناہ پر اس سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی۔ شرابی کے فعل کے دو اجزا ہیں: ایک اس کا شراب پینا جو اپنی ایک مخصوص تاثیر رکھتا ہے۔ دوسرے اس کا حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرنا جس کا نتیجہ حق تعالیٰ کا عتاب ہے۔ شرابی جب توبہ کرے گا اور اسکی توبہ قبول کی جائے گی، تو دوسرا جزء ساقط ہو جائے گا۔ لیکن پہلا جزء اپنے نتائج کے ساتھ باقی رہے گا۔ بالکل اسی طرح حضرت آدم کا شجرۂ ممنوع کے قریب جانا بھی دو اجزاء پر مشتمل تھا۔ ایک ان کا نفس فعل جس کی ایک مخصوص تاثیر تھی۔ دوسرے ان کے فعل کی یہ حیثیت کہ وہ فرمان الٰہی کے خلاف تھا۔ جب حضرت آدم نے توبہ کی اور وہ قبول ہو گئی تو دوسرا جزء اپنے نتیجہ (یعنی عتاب الٰہی) کے ساتھ ساقط کر دیا گیا۔ مگر پہلا جزء بحال رہا جس کا نتیجہ ہبوط تھا۔

مسئلہ غلامی غلامی کے مسئلہ میں قرآن مجید نے یہ بات مسلمانوں کے اختیار پر موقوف رکھی ہے کہ خواہ احسان کے طور پر اسیران جنگ کو رہا کریں خواہ فدیہ (بصورت نقد یا بصورت مبادلۂ اسیران) لے کر چھوڑ دیں۔ یہ کہیں حکم نہیں دیا ہے کہ اگر دوسری صورت نہ ہو تو پہلی صورت پر عمل کرنا لازم ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ فطرت انسانی سے واقف ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ اگر معاملہ دو چار یا دس پانچ قیدیوں کا ہو تو مسلمان بطیب خاطر ان کو بطور احسان رہا کر سکتے ہیں، جیسا کہ انھوں نے عہد رسالت اور عہد صحابہ میں بارہا کیا ہے۔ لیکن اگر سینکڑوں

ہزاروں قیدیوں کا معاملہ ہو تو ایسی صورت میں جبکہ مسلمانوں کے بھی سینکڑوں ہزاروں آدمی کفار کے پاس قید ہوں اوران کو غلام بنا کر رکھا گیا ہو، مسلمانوں کے لیئے یہ بہت مشکل ہو گا کہ وہ کفار کے آدمیوں کو محض احسان کے طور پر رہا کر دیں۔ اس دوسری صورت میں اسیران جنگ کی رہائی کے لیئے صرف یہی ایک راستہ کھلا ہوا ہے کہ یا تو وہ زرِ فدیہ ادا کر کے رہا ہوں یا اسیران جنگ کا مبادلہ ہو۔ اب اگر اسیران جنگ زرِ نقد ادا کر سکتے ہوں اور کفار سے مبادلہ کا معاملہ طے نہ ہو سکے، اور کفار کے ہاں مسلمان قیدیوں کی حیثیت مملوکوں کی سی ہو، جیسی کہ فی الواقع ہزار برس بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ تک رہی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حق نہ ہو کہ وہ کفار کے قیدیوں کو غلام بنا کر رکھیں؟ آپ اس مسئلہ پر ان حالات کی روشنی میں غور فرما رہے ہیں جبکہ غیر مسلم قوموں میں اسیران جنگ کو غلام بنانے کی رسم موقوف ہو چکی ہے، مبادلہ اسیران کا طریقہ عام طور پر رائج ہو چکا ہے اور وہ حالات باقی نہیں رہے جن میں اسیران جنگ کو غلام بنانے پر مسلمان مجبور ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کو غلامی کے اسلامی قانون کا جواز تسلیم کرنے میں تامل ہو رہا ہے۔ لیکن اگر آپ ان حالات پر نظر رکھیں جو اب سے سو برس پہلے تک دنیا میں رائج رہے ہیں، تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اسلامی قانون میں غلامی کے لیئے جو گنجایش رکھی گئی ہے وہ بے جا نہیں ہے۔ یہ درصل قرآن مجید کا کمالِ حکمت ہے کہ اس نے غلامی کے مسئلہ میں ایسا حکم دیا جس میں وقت کے حالات کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی تھی، اور آیندہ کے لیئے ایک اصلاحی قانون بھی بنا دیا گیا تھا تاکہ جب وہ حالات بدل جائیں تو آپ سے آپ وہ قانون نافذ ہو جائے۔

آپ نے غلامی کے مسئلہ پر جو اظہار خیال فرمایا ہے اس کا پہلا مقدمہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی رو سے غلامی ناجائز ہے۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ صحابہ اور اہل بیت رضی اللہ عنہم اسیران جنگ کو غلام بناتے رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صحابہ اور اہل بیت کا فعل قرآن کے خلاف اور ناجائز تھا۔ آپ تاریخی حدود میں جا کر اور اسباب و حالات کی مجبوریوں پر بحث فرما کر خواہ کیسا ہی کافی اور شافی جواب عطا فرمائیں، مگر خود آپ کے اپنے مقدمات سے جو منطقی نتیجہ نکلتا ہے اس پر آپ کسی طرح پردہ نہیں ڈال سکتے۔ آپ کو نہ صرف یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خلفائے

راشدین، اور اصحاب رسول اور اہل بیت رسول علیہم الرحمہ کا فعل قرآن مجید کے حکم کے خلاف اور ناجائز تھا، بلکہ آپ کو یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ معاذ اللہ قرآن مجید نے قبل از وقت ایک ایسا غیر حکیمانہ قانون بنا دیا تھا جس میں وقت کے حالات کی کوئی رعایت ملحوظ نہ رکھی گئی تھی، جس پر تیرہ سو برس تک عمل کرنا دشوار رہا، اور جس پر وہ لوگ بھی عمل درآمد نہ کر سکے جو خاص سرکار رسالت مآب کے تربیت یافتہ تھے اور جنھوں نے اپنی زندگیوں کو اسلامی تعلیم کے سانچے میں ڈھالنے کی وہ انتہائی کوشش کی تھی جو کسی انسان کے امکان میں ہے۔

یہ محض منطقی قیاس ہی نہیں ہے بلکہ اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آیت فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَاءً کے جو معنی آپ بیان فرما رہے ہیں اگر وہی اسلام کا قانون قرار پاتے تو مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ اور قطعاً ناقابل عمل ہوتے۔ اس قانون پر عمل درآمد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر کفار زر فدیہ ادا نہ کریں اور اسیران جنگ کا مبادلہ بھی قبول نہ کریں تو مسلمان بہر صورت ان کے قیدیوں کو رہا کرنے پر مجبور ہیں۔ اگر مسلمانوں کا قانون یہی ہوتا تو کوئی کافر قوم اتنی احمق نہ تھی کہ زر فدیہ ادا کرتی یا مسلمانوں کے قیدیوں کو رہا کر دیتی۔ اس صورت میں لاکھوں مسلمان کفار کے ہاتھ قید ہوتے اور کبھی رہا نہ ہو سکتے، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلامی کی مصیبت میں گرفتار رہتے؛ اور اس کے مقابلہ میں کافروں کے آدمی ہر لڑائی کے بعد آزاد ہو جایا کرتے۔ آپ ہی فرمائیے کیا ایسا قانون منصفانہ کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا کسی زمانہ میں اس پر انسان عمل کر سکتے ہیں؟

ملکیت زمین آپ نے اس مسئلہ میں خلط بحث کر دیا۔ اور میرے اصل اعتراض کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آپ نے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اس آیت کی رو سے زمین کی شخصی ملکیت جائز نہیں ہے۔ اس پر میرا اعتراض دو حیثیتوں سے ہے:-

ایک یہ کہ نظام تمدن میں ایسی انقلاب انگیز اساسی ترمیم کے لیے محض اتنا سا اشارہ کافی نہیں ہے۔ اگر قرآن کا منشا یہی ہوتا جو آپ فرما رہے ہیں تو وہ صاف الفاظ میں نہ صرف پرانے دستور کو بند کرنے کا حکم دیتا بلکہ آئندہ کے لیے زمین سے انتفاع کا نیا طریقہ بھی بتا دیتا۔

دوسرے یہ کہ اگر قرآن مجید کا منشا یہی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا ؟ آنحضرت صلعم کی بعثت کا اصل مقصد یہی تھا کہ عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن ہر چیز میں قرآنی احکام کے مطابق اصلاح فرمائیں، اور دنیا میں قرآن کا قانون جاری کر دیں۔ وہ حالات کی بندگی کرنے کیلئے نہیں آئے تھے بلکہ خدا کی بندگی کرنے کے لیے آئے تھے۔ ان کا کام دنیا کی روش پر چلنا نہ تھا، بلکہ دنیا کی روش کو بدلکر قرآن کی بتائی ہوئی روش پر چلانا تھا۔ اب اگر ایک طرف آپ کے قول کے مطابق یہ مان لیا جائے کہ قرآن کا مقصد زمین کی شخصی ملکیت کو مٹانا تھا، اور دوسری طرف اس ناقابل انکار حقیقت کی طرف نظر کی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پرانے دستور کو نہیں مٹایا بلکہ اسی کے مطابق عمل کرتے رہے، تو لامحالہ دو باتوں میں سے ایک بات ماننی پڑے گی۔ یا یہ کہ قرآن کے اس مقصد سے آنحضرت صلعم خود بے خبر تھے۔ یا یہ کہ حضور کو اس کا علم تھا مگر آپ نے قرآن کے اس حکم پر عمل نہ کیا اور قرآن کے بتائے ہوئے دستور پر اس دستور کو ترجیح دی جو رضائے الٰہی کے خلاف دنیا میں رائج تھا۔ فرمائیے کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کون سا پہلو آپ اختیار کرتے ہیں ؟

میرے ان اصولی اعتراضات سے پہلو تہی کر کے آپ نے قرآن کے متعلق اپنے زاویہ نگاہ کی تشریح شروع کر دی جس سے معاملہ سلجھنے کے بجائے اور زیادہ الجھ گیا۔ آپ کی اس تشریح سے یہ بات نکل گئی (جو پہلے ذرا چھپی تھی) کہ آپ قرآن مجید کی زیر بحث آیت کو اشتراکیت (Com munism) کے سانچے میں ڈھال کر دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا وہ علاج کرنا چاہتے ہیں جسے کارل مارکس نے تجویز کیا اور لینن نے عملی جامہ پہنایا۔ اس نقطۂ نظر سے آپ کو چاہیے تھا کہ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ کے بجائے خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (۲ : ۳) سے فائدہ اٹھاتے تاکہ نہ صرف زمین بلکہ جملہ اقسام کے مال و دولت کی شخصی ملکیت ناجائز ٹھیرتی، زمین کے جانور بھی (جن پر آپ نے از روئے قرآن شخصی ملکیت کا حق تسلیم کیا ہے) تمام انسانوں کی مشترک ملکیت قرار پاتے، روپیہ پیسہ بھی (جس میں خود آپ کے اعتراف کے مطابق قرآن نے زکوٰۃ اور وراثت کے قوانین جاری کیے ہیں) تمام انسانوں میں مساوات کے ساتھ تقسیم ہوتا، اور

ایک ہی وہلہ میں دولت کی غیر مساویانہ تقسیم کا ایسا سدباب ہوتا کہ اسلام اور کمیونزم بغلگیر نظر آنے لگتے۔

اسلام اور ایمان قرآن مجید میں لفظ اسلام دو معنوں میں استعمال ہوا ہے :-

ایک لغوی معنی جو اطاعت و انقیاد کا مترادف ہے۔ مثلاً وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۳ : ۷۷) اور اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ (۲۷ : ۳) اس معنی میں اسلام، ایمان سے علیحدہ ہے۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا (۴۹ : ۲) فرمایا گیا ہے۔

دوسرا اصطلاحی معنی جس میں "اسلام" خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ دین کا نام ہے (اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ) اس معنی میں اسلام کے متحقق ہونے کے لئے ایمان کا متحقق ہونا ضروری ہے، اور جب تک کوئی شخص مومن نہ ہو، وہ اس معنی میں مسلم نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں یہ اصطلاحی "اسلام"، ایمان کا ہم معنی آیا ہے۔ مثلاً يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ (۱۰ : ۹) اور قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ...... وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (۲ : ۱۶) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کا نام اسی دوسرے معنی میں "مسلم" رکھا ہے۔ اسی معنی میں حضرت ابراہیم ؑ نے اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کہا۔ اور اپنی اولاد کو وصیت کی کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۲ : ۱۶) اسی معنی میں اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳ : ۲) کہا گیا ہے، اور رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵ : ۱) کہہ کر اسے پسندیدگی کی سند عطا کی گئی ہے۔

آپ نے ان دونوں معنوں میں کوئی فرق نہیں کیا اور لکھ دیا کہ "اسلام اور ایمان میں ظہور اور بطون کا فرق ہے۔ اللہ نے ظہور کی بنیاد پر ہمارا نام مسلم رکھا ہے"۔ پھر آپ اس سے بھی آگے بڑھ گئے اور آپنے یہ دعویٰ کیا کہ مسلمان کو ایمان کا دعویٰ کرنے سے روکا گیا ہے۔ یہ بات قرآن مجید کی تصریحات کے خلاف تھی، اور اسی پر میں نے اعتراض کیا تھا نہ کہ معاذ اللہ قرآن پر۔

مسئلۂ تقدیر اس مسئلہ کے متعلق میں نے جو کچھ عرض کیا تھا آپ نے اس پر غور نہیں فرمایا۔ میری گزارش یہ تھی کہ عقیدۂ تقدیر اسی طرح ایمان باللہ کے اجزاء میں سے ہے جس طرح خدا کو سمیع، علیم، بصیر، وغیرہ ماننا۔ جب تک انسان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا صحیح علم حاصل نہ ہو اور یہ علم ایمان کی صورت اختیار نہ کرلے، اسوقت تک ایمان باللہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا عقیدۂ تقدیر بہرحال ایمانیات سے ہے، خواہ آپ اسکو ایمان مجمل میں شامل قرار دیں یا ایمان مفصل میں۔ حضرت یوسف کے بھیڑیئے کی برأت سے اگر انسان خالی الذہن ہو تو ایمان میں نقص واقع نہ ہوگا۔ لیکن اگر تقدیر کے عقیدہ سے انسان خالی الذہن ہو تو ایمان ناقص ہوجائے گا اور عمل پر اس کا اثر پڑے گا۔ ان دونوں باتوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ آپ جیسے صاحب علم کا اس سے چشم پوشی کرنا قابل تعجب ہے۔ کیا آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں عقیدۂ تقدیر پر کتنا زور دیا ہے۔ کتنی کثرت سے مختلف مواقع پر اسکو پیش کیا ہے، اور کیسے کیسے اخلاقی فوائد اس عقیدہ پر متفرع ہوتے ہیں؟

اتباع علماء و صلحاء آیۂ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ سے میں نے جو استدلال کیا تھا اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور پر علماء اہل کتاب سے وحی کی تصدیق چاہنے کے لیے نازل ہوئی تھی۔ میں بھی جانتا ہوں کہ آیت کی شان نزول یہی ہے۔ مگر کیا اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ جس مسئلہ کے متعلق آدمی کو کافی واقفیت نہ ہو یا جس میں اسکو کچھ شک ہو، اس کے بارے میں اہل علم سے سوال کرنا چاہیئے؟ آپ نے اپنے مدعا کی تائید میں جو آیت پیش کی ہے وہ تو میری پیش کردہ آیت سے بھی زیادہ میرے مدعا کی تائید کرتی ہے۔ اس میں تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ اگر آپ کو شک ہو تو اہل کتاب کے علماء سے دریافت کرلیجیے۔ غور فرمائیے کہ جب نبی کو یہود و نصاریٰ کے علماء سے دریافت کرنے کی ہدایت ہوتی ہے تو عام مسلمانوں کے لیے مسلمان علماء سے دین کے مسائل دریافت کرنا کیونکر ناجائز ہوسکتا ہے؟ اسی طرح اولٰئك الذين هدى الله فبهداهم اقتده کے متعلق آپ کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیائے سابقین کا اقتداء کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ میں بھی جانتا ہوں کہ ایسا

ہی ہے۔ مگر کیا اس آیت سے یہ قاعدۂ کلیہ نہیں نکلتا کہ جو لوگ ہدایت یافتہ ہوں اور خدا کی بتائی ہوئی راہ راست پر چلتے ہوں انکی پیروی کرنی چاہیے ؟ آپ فرماتے ہیں کہ علماء و صلحاء کے کسی قول کو بلا قرآنی سند کے اصل دین سمجھ لینا قطعی شرک ہے۔ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ جو شخص کسی انسان کے قول کو خدا کے قول کے برابر درجہ دے، یا خدا کے قول کو چھوڑ کر کسی انسان کا قول اختیار کرے وہ مسلمان نہیں ہے۔ لیکن آپ فرمائیے کہ اگر کوئی مسلمان خود کتاب کا علم نہ رکھتا ہو، اور کسی صاحب علم سے کتاب کے احکام اور کتاب کی تعلیمات دریافت کرے، اور اسکی بتائی ہوئی باتوں کو یہ سمجھ کر قبول کرے کہ اس نے جو کچھ بتایا ہے کتاب کے مطابق بتایا ہے، وہ آخر کس گناہ کا مرتکب ہوتا ہے ؟ اور قرآن کی کونسی آیت کی رو سے اسکو مشرک یا گنہگار قرار دیا جا سکتا ہے ؟ آپ کہتے ہیں کہ علماء کی کوئی بات نہ مانو جب تک کہ وہ قرآنی سند نہ پیش کریں۔ مگر آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآنی سند کو جانچنا عالم کا کام ہے نہ کہ عامی کا۔ جو شخص خود اتنا علم نہ رکھتا ہو کہ قرآنی سند کو جانچ کر عالم کی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکے، اس کے لیے تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ جس عالم کے علم اور تقویٰ پر اسکو اعتماد ہو اسکی بات مان لے، اور یہ سمجھتے ہوئے مان لے کہ اس کا قول کتاب و سنت کے مطابق ہی ہوگا۔ اگر جاہل عامیوں میں یہ اسپرٹ پیدا ہو جائے کہ وہ علماء کے بتائے ہوئے مسائل کو نہ مانیں اور خود اپنے ناکافی علم کے ساتھ قرآن کا الٹا سیدھا مطلب سمجھ کر اجتہاد کرنا شروع کر دیں تو مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں سخت ابتری پھیل جائے گی۔ ہر شخص اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ چننے لگا۔ آج آپ [illegible] فرقوں کو روتے ہیں، مگر اس صورت میں تو فرقوں کا شمار لاکھوں سے بھی متجاوز ہو جائے گا بلکہ سرے سے کوئی جمعیت باقی ہی نہ رہے گی۔

تقریظ وانتقاد

"تعلیمات قرآن"

(۳)

اتباع واطاعتِ رسولؐ جن امور میں مجھ کو مولف سے شدید اختلاف ہے وہ رسالت اور اس کے احکام سے متعلق ہیں۔ اس معاملہ میں فاضل مؤلف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو گروہ "اہل قرآن" اور "منکرین حدیث" کا مسلک ہے۔ کتاب کے صفحہ ۵۹ پر وہ لکھتے ہیں:۔

اُصولی قانون صرف اللہ کی کتاب ہے۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ — جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے اوپر اتارا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے سوا اولیا کی پیروی نہ کرو

جملہ ضوابط اسی کی روشنی میں باہمی مشورہ سے بنائے جائیں گے

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ — اور انکی حکومت آپس کے مشورے سے ہے"

یہاں مؤلف نے بیچ میں سے اسوۂ رسول کو صاف اڑا دیا ہے۔ انکی تجویز یہ ہے کہ قرآن کریم سے اصول لے کر مسلمان باہمی مشورہ سے تفصیلی قوانین مرتب کر لیا کریں۔ لیکن ان دونوں کڑیوں کے درمیان سلسلہ کی ایک اور کڑی بھی تھی جس کو خود اللہ تعالیٰ نے ہی اس زنجیر میں پیوست کیا تھا۔ وہ کڑی یہ ہے

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ — اے محمد! کہو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی

يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳ : ۴) کر و خدا تم سے محبت کرے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اصولی قانون قرآن ہی ہے مگر یہ قانون ہمارے پاس بلا واسطہ نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ رسول خدا کے واسطہ سے بھیجا گیا ہے اور رسول کو درمیانی واسطہ اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ اصولی قانون کو اپنی اور امت کی عملی زندگی میں نافذ کر کے ایک نمونہ پیش کردیں، اور الہی ہدایت سے وہ طریقے متعین کردیں جن سے یہ اصولی قانون نافذ کیا جا سکتا ہے۔ پس قرآن مجید کے مطابق صحیح ضابطہ یہ ہے کہ پہلے خدا کا بھیجا ہوا اصولی قانون، پھر خدا کے رسول کا بتایا ہوا طریقہ، پھر ان دونوں کی روشنی میں ہمارے اولی الامر کا اجتہاد۔

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ (۴ : ۸)

اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی بات میں نزاع ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ کا فقرہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ مسائل شرعی میں جب مسلمانوں کے درمیان نزاع اور اختلاف واقع ہو تو حکم ہے کہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اگر مرجع صرف قرآن مجید ہوتا تو صرف فردوہ الی اللہ کہنا کافی تھا۔ لیکن اس کے ساتھ والرسول بھی کہا گیا جس میں صاف اشارہ ہے کہ قرآن کے بعد رسول کا طریقہ تمہارے لیے مرجع ہے۔

اس کے بعد مؤلف نے صفحہ ۱۲۸ پر لکھا ہے :-

رسولوں کا فریضہ صرف پیغام الہی پہونچانا ہے اور بس

مَا عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ (۵ : ۱۳) رسول کے اوپر کچھ نہیں ہے بجز اس کے کہ وہ (پیغام) پہنچا دیں

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (۳۶ : ۲) ہمارے اوپر سوائے واضح تبلیغ کے اور کچھ نہیں ہے"

آگے چل کر صفحہ ۱۵۵ پر پھر لکھتے ہیں :-

"اور بحیثیت منصبِ رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس

اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲ : ۵) — تیرے اوپر صرف تبلیغ ہے

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۶۴ : ۲) — اگر تم نے منہ پھیر لیا تو ہمارے رسول پر صرف کھلی ہوئی تبلیغ ہے اور بس

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (۱۳ : ۶) — تجھ پر پہنچانا ہے اور ہمارے اوپر حساب لینا ہے"

یہاں مؤلف نے آیات کے سیاق و سباق اور فحوائے کلام کو نظر انداز کر کے رسالت کے منصب کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ گویا وہ محض ایک نامہ بر کا منصب ہے۔ حالانکہ یہ تمام آیات دراصل کفار کے مقابلہ میں نازل ہوئی ہیں۔ جو لوگ روگردانی کرتے تھے، اور رسول کو جھٹلاتے تھے ان سے کہا گیا ہے کہ رسول کا کام ہمارا پیغام پہنچا دینا تھا سو اس نے پہنچا دیا۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے پاس کوئی رہنما نہیں بھیجا گیا۔ مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ (۵ : ۳) اب خدا پر تمہاری کوئی حجت باقی نہیں رہی۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴ : ۲۳) اب تم نہ مانو گے تو اپنا کچھ بگاڑو گے فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۵ : ۳) اسی طرح رسول اللہ صلعم سے بھی کہہ دیا گیا کہ تم ان کافروں کی روگردانی سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو؟ تم ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے ہو، تم پر ان کی ہدایت و ضلالت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے تمہارا کام پیغام الٰہی کا پہونچا دینا تھا، سو تم نے یہ کام کر دیا۔ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲ : ۵) فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸)

یہ سب کچھ کفار کے مقابلہ میں ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر لیں، اور امت مسلمہ میں داخل ہو جائیں تو ان کے لیے رسول کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے، بلکہ آپ ان کے لیے معلم اور مزکی بھی ہیں، اسلامی زندگی کا نمونہ بھی ہیں، اور ایسے امیر بھی ہیں جس کی اطاعت ہر زمانے میں بے چون و چرا کی جانی چاہیے۔ معلم کی حیثیت سے آپ کا کام یہ ہے کہ پیغام الٰہی کی تعلیمات اور اس کے قوانین کی تشریح و توضیح کریں (وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲ : ۱۵) مزکی ہونے کی حیثیت سے آپ کا کام یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات

اور قوانین کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کریں اور ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھالیں (وَيُزَكِّيهِمْ ۲: ۱۵)
نمونہ ہونے کی حیثیت سے آپ کا کام یہ ہے کہ خود قرآنی تعلیم کا عملی مجسمہ بن کر دکھا دیں، تاکہ آپ کی زندگی اس زندگی
کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہو جو قرآن کے مقصود کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیئے، اور آپ کے ہر قول اور ہر فعل
کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ ایسا ہی قول اور ایسا ہی فعل (جو لازم نہیں کہ بعینہ وہی قول اور وہی فعل ہو) قرآن کے
مقصود کے مطابق ہے، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ قرآن کے خلاف ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۳۳: ۳) - اور وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ - ۵۳: ۱)
اس کے ساتھ حضور کی حیثیت امیر کی بھی ہے۔ مگر وہ امیر نہیں جس سے نزاع کی جا سکے، بلکہ وہ امیر جس کے حکم کو
بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے، جیسا قرآن کی آیت کو ماننا فرض ہے (فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ
فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ - ۴: ۸ - وَمَن يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ - ۴: ۸) اور
وہ امیر نہیں جو صرف اپنی زندگی ہی میں امیر ہوتا ہے، بلکہ وہ امیر جو قیامت تک کے لیے امت مسلمہ کا امیر ہے
جس کے احکام مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر حال میں مرجع ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کی جتنی آیات اوپر پیش کی
گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی زمانہ کے ساتھ مقید نہیں ہے، نہ منسوخ ہے۔

مولف نے منصب رسالت کے ان مراتب کو سمجھنے میں دو بہت بڑی غلطیاں کی ہیں :-

اولاً، انھوں نے بعض آیات کا غلط مفہوم لے کر رسول کا کام صرف تبلیغ (یعنی نامہ بری) میں محدود
کردیا، پھر تعلیم کتاب و حکمت، اور تزکیۂ نفوس، اور نمونہ بن کر دکھانے کے جملہ مراتب کو "تبلیغ" کے ضمن میں شامل کردیا
حالانکہ قرآن مجید میں تبلیغ کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کو ایک مستقل مرتبہ اور بجائے خود منصب رسالت کا ایک جزو قرار
دیا گیا ہے۔ اس فرق مراتب کو ملحوظ نہ رکھنے اور بعد کے مراتب کی اہمیت کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ مولف
کے لیے منصب رسالت کا سمجھنا دشوار ہو گیا۔ وہ نہ سمجھ سکے کہ معلم کتاب و حکمت اور مزکی نفوس اور قابل تقلید نمونہ
ہونے کی حیثیت سے آنحضرت کی زندگی کیا اہمیت رکھتی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ :-

"آیت وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ کا یہ مفہوم قرار دینا کہ رسول اللہ جو کچھ کلام کرتے تھے وہ سب کا سب وحی تھا صحیح نہیں ہے ۔ کیونکہ دعویٰ قرآن کے وحی ہونے کا تھا جس کا کفار انکار کرتے تھے اس کے بارے میں کہا گیا کہ وہ جو کچھ بولتے ہیں وحی ہے ۔ گھر میں یا ازواج مطہرات یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ کفار کو کوئی بحث تھی "

اس تقریر کو جب ہم مولف کی ان عبارتوں کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ "رسول کا کام صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس" ، اور یہ "رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا پیغام جو وہ لایا ہے اس پر عمل کیا جائے " اور یہ کہ " ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے " ، تو اس سے مولف کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمدؐ ابن عبداللہ بحیثیت رسول ، اور محمدؐ ابن عبداللہ بحیثیت انسان کے درمیان فرق کر دیں ۔ رسول ہونے کی حیثیت سے آنحضرت قرآن کی جو تعلیم دیں اور قرآن کے مطابق جو احکام دیں ، وہ تو مولف کے نزدیک سمع وطاعت کے مستحق ہیں ۔ مگر بحیثیت انسان آپ کے اقوال و افعال ویسے ہی ہیں جیسے ایک انسان کے ہوتے ہیں ان کا خدا کی طرف سے ہونا ، اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونا ، اور ضلالت و غوایت سے پاک ہونا مولف کے نزدیک مسلم نہیں ہے اور نہ جناب مولف ان کے اندر امت مسلمہ کے لئے کوئی قابل تقلید نمونہ پاتے ہیں ۔

لیکن یہ تفریق جو انھوں نے محمدؐ ابن عبداللہ بحیثیت مبلغ قرآن اور بحیثیت انسان کے درمیان کی ہے ، قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہے ۔ قرآن میں آنحضرت صلعم کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے ۔ جس وقت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا ، اس وقت سے لیکر حیات جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے ۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسول خدا کی حیثیت سے تھا ، اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے ، مربی اور مزکی بھی تھے ، قاضی اور حاکم بھی تھے ، امام اور امیر بھی تھے ، حتیٰ کہ آپ کی خانگی اور عائلی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت

آ گئے تھے، اور ان تمام حیثیتوں میں آپ کی حیات طیبہ ایک انسان کامل اور مسلم قانت اور مومن صادق کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی جس کو حق تعالیٰ نے ہر اس شخص کے لیے بہترین قابل تقلید نمونہ قرار دیا تھا جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ (۳۳: ۲۱) قرآن مجید میں کہیں کوئی ضعیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور حیثیت انسانی اور حیثیت امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور یہ فرق کیسے کیا جا سکتا ہے؟ جب آپ خدا کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی شریعت کے ماتحت ہو اور اس شریعت کی نمائندہ ہو۔ اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔ اسی بات کی طرف سورۂ نجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ۔ تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بے راہ ہوا اور نہ گمراہ ہوا۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ اسکی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ۔ اسکو ایسے استاد نے تعلیم دی ہے جس کی قوتیں بڑی زبردست ہیں۔ جناب مؤلف فرماتے ہیں کہ ان آیات میں قرآن کے وحی ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے۔ لیکن مجھے ان آیات میں کہیں کوئی خفیف سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا۔ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ میں هُوَ کی ضمیر نطق رسول کی طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ میں کیا گیا ہے۔

ان آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر نطق رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جا سکتا ہو۔ ہر بات جس پر نطق رسول کا اطلاق ہوگا، آیات مذکورہ کی بنا پر وحی ہوگی، اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اسی لئے کی گئی ہے کہ رسول کو جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے، ان کو رسول کے ضلالت اور غوایت اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کامل اطمینان ہو جائے اور جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے۔ ورنہ اگر کسی ایک بات میں بھی یہ شبہ ہو جائے کہ وہ ہوائے نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے تو رسول کی رسالت پر سے اعتماد

اُٹھ جائے۔ کفار اسی چیز کے منکر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ رسول کو نعوذ باللہ جنون ہے، یا کوئی آدمی اس کو پڑھاتا ہے یا وہ اپنے دل سے باتیں بنایا کرتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر اس غلط خیال کی تردید کی ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ نہ تمہارا صاحب بے راہ یا گمراہ ہے، نہ وہ ہوائے نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے۔ اس کی زبان مبارک سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے جو خاص ہماری طرف سے ہے۔ اور اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں پڑھاتا بلکہ وہ معلم سبق دیتا ہے جو شدید القویٰ ہے۔ یہی بات خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمائی ہے کہ فو الذی نفسی بیدہ لا مایخرج منہ الا حقاً "اس ذات پاک کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے"۔

افسوس ہے کہ صاحب تعلیمات قرآن کو اس حقیقت سے انکار ہے اور وہ فرماتے ہیں کہ "آنحضرتؐ اپنے گھر میں ازواج مطہرات سے یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے اس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا، نہ کفار کو کوئی بحث تھی"۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کرتے تھے رسول کی حیثیت سے کرتے تھے، سب کچھ ضلالت و غوایت اور ہوائے نفس سے پاک تھا، اور اللہ نے جو فطرت سلیمہ آپ کو عنایت فرمائی تھی، اور تقویٰ و پاکیزگی کے جو حدود آپ کو بتائے تھے، آپ کے تمام اقوال و افعال اُسی فطرت سے صادر اور انہی حدود سے محدود ہوتے تھے، ان کے اندر تمام عالم انسانی کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ تھا، اور انہی سے ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ کونسی چیز حرام ہے اور کون سی حلال۔ کون سی باتیں حق تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں اور کون سی اس کے خلاف ہیں۔

ثانیاً، انھوں نے رسول اللہ کی حیثیت امارت کو حیثیت رسالت سے الگ کردیا ہے جس کا ثبوت قرآن میں نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"اطاعت بحیثیت رسول اور اطاعت بحیثیت امیر میں دو باتوں کا فرق ہے۔

(۱) بحیثیت رسالت رسول اللہ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہ تھا بلکہ فریضہ تبلیغ اللہ کی طرف سے

آپ کے ذمے لازم کیا گیا تھا۔ یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (۵: ۱۰) اور امیر کی حیثیت سے لوگوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ (۳: ۱۷)

(۲) بحیثیت رسول آپ کی اطاعت قیامت تک فرض ہے کیونکہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہے لیکن بحیثیت امیر آپ کی اطاعت بالمشافہ تھی یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (۸: ۳) اور امارت کے فرائض ہمیشہ ہنگامی ہی ہوں گے کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج جو امیر ہوگا وہ غزوۂ بدر و اُحد کی متابعت میں صرف نیزہ و شمشیر سے جہاد میں کام نہ لے گا بلکہ موجودہ زمانہ کے اسلحہ استعمال کرے گا۔ امراء کے مقابلہ میں منازعت کا حق حاصل ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ (۴: ۸)''

یہ سب کچھ قرآن کے منشا کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ چونکہ مولف نے یہ نہیں سمجھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے بلکہ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے، اور آپ کی امارت آپ کی رسالت سے الگ نہ تھی بلکہ آپ رسول خدا ہونے کی حیثیت ہی سے امیر تھے۔ اس لیے انھوں نے رسول اللہؐ کی حیثیت امارت کو عام امراء کی حیثیت امارت کے مانند سمجھ لیا۔ پھر اس کی تائید میں قرآن کی جن آیات سے استدلال کیا ہے اُن کو بھی وہ ٹھیک نہیں سمجھے ہیں۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی امت کے امراء کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے شوریٰ Democracy کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی کریں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حیثیت، دوسرے امراء کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲: ۳) اور یہ کہ اگر اہل شوریٰ میں نزاع ہو تو وہ خدا اور رسول کی طرف رجوع کریں۔ (فَاِنْ

تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ (۴: ۸) لیکن رسول اللہ صلے اللہ علیہ سلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرما لیں تو خدا پر بھروسہ کرکے عمل کا اقدام فرمائیے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (۳: ۱۷) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپ کو شوریٰ کا حکم صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح شوروی طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔

رہی یہ بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضرت صلعم کی اطاعت صرف آپ کے عہد تک تھی تو یہ بھی غلط ہے اور جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ مؤلف نے وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ سے یہ سمجھا ہے کہ اطاعت رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت اس حکم کو سن رہے تھے۔ لیکن اگر وہ سورۂ انفال کو ابتدا سے پڑھتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ وہاں مقصود کچھ اور ہے۔ ابتدا میں فرمایا گیا ہے کہ وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (اگر تم ایمان رکھتے ہو تو خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو) پھر ان لوگوں کو ڈانٹا گیا ہے جو رسول اللہ کی دعوت جہاد پر دلوں میں کڑھتے تھے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ (اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول سے جھگڑا کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے) اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ۔ اس آیت میں اور پچھلی تمام آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پھر لفظ رسول آیا ہے۔ امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا، اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو۔ پھر رسول کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اوپر دی جا چکی ہے۔ اس کے بعد وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کہنے کا منشا صاف یہ ہے کہ تم ہمارے ان تاکیدی احکام کو سنتے ہوئے ہمارے رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو۔ اس انتم اور تسمعون کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے بلکہ قیامت تک جو

لوگ ایمان کے ساتھ قرآن کو سنیں گے ان سب پر لازم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہنچے اس کے آگے سرتسلیم خم کردیں اور خدا کے عذاب سے ڈریں۔

اور یہ جو مؤلف نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض امارت اسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے امراء کے ہوا کرتے ہیں، کیونکہ آج ہم جہاد میں بدر و احد کی طرح نیزہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے، تو یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اپنے عہد میں جن اسلحہ سے کام لیا تھا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حضور نے اپنی لڑائیوں میں جو اخلاقی ضوابط برتے تھے اور جن ضوابط کو برتنے کی ہدایت فرمائی تھی وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے، بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے ایک دائمی قانون جنگ بنا دیا ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا بندوق یا توپ۔ بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلحہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، کس پر استعمال کرتے ہیں، اور کس طرح ان سے خونریزی کا کام لیتے ہیں۔ اس باب میں جو نمونہ آنحضرت صلعم نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے، اور معنوی حیثیت سے سرورِ عالم قیامت تک کے لیے ہر مسلمان فوج کے سپہ سالارِ اعظم ہیں۔

مؤلف نے امارت اور رسالت میں ایک فرق اور بھی بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ امراء سے منازعت کا حق حاصل ہے۔ اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ امارت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے امراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منازعت کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی، اور صرف اتنی سی گستاخی پر تمام عمر کے اعمال غارت ہوجانے کی دھمکی دی گئی تھی (۴۹: ۱) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دیئے جانے کا خوف دلایا گیا تھا (۴: ۱۷) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اس امیر کی امارت اور کہاں ان امراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

مؤلف نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیثیتِ امارت اور عام امراء کی حیثیت امارت میں قطعاً کوئی امتیاز نہیں رکھا ہے، حتیٰ کہ ان تمام احکام کو جو اطاعت رسول سے متعلق ہیں، اطاعت امیر کے احکام قرار دیا ہے جیسے ۷، ۱۵

کے حاشیہ پر لکھتے ہیں :-

"اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں ان سے مراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں مثلاً یسئلونک عن الانفال قل الانفال للہ والرسول (۸ : ۱) مال غنیمت کا حکم صرف عہد رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آیندہ کے لئے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فریضہ ہے"

پھر فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول کے متعلق صفحہ ۲۰۸ پر حاشیہ لکھتے ہیں:-

"آخری اختیار اللہ رسول یعنی امارت ہے۔ اسلیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا"

یہ حق سے صریح تجاوز ہے۔ قرآن مجید میں اطاعت خدا، اطاعت رسول، اور اطاعت اولی الامر کے تین مراتب بیان کئے گئے ہیں۔ اطاعت خدا سے مراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعت رسول سے مراد رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے۔ اور اطاعت اولی الامر سے مراد مسلمانوں کے امراء اور ارباب حل و عقد کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں بیسیوں جگہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تیسرا مرتبہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت، خدا و رسول کے احکام کے تابع ہے، اور نزاع کی صورت میں خدا و رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہوتے ہوئے اسکی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مراد امارت لی جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب امارت کو اس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے امراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں قل الانفال للہ والرسول سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ "اموال غنیمت خدا اور رسول کے لیے ہیں"، کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسول نے اسلامی جماعت کا جو

نظام قائم کیا ہے اس کے مصالح میں یہ غنائم صرف کیے جائیں۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد امارت ہے؟

حدیث کے متعلق مؤلف کا مسلک حدیث کے متعلق مؤلف نے قریب قریب وہی مسلک اختیار کیا ہے جو منکرین حدیث کے ایک بڑے گروہ کا مسلک ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"تعلیم کتاب کا ایک شعبہ یہ بھی تھا کہ رسول اس کے احکام پر عمل کرکے دکھا دے تاکہ امت اسی نمونہ پر عمل پیرا ہو جائے

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔	تمہارے لیے رسول اللہ کے اندر اچھا نمونہ ہے۔

چنانچہ ہمارے رسول نے جملہ احکام قرآن مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ پر عمل کرکے دکھلا دیا اور مسلمان اسی نمونہ پر عمل کرنے لگے۔ یہ اسوۂ حسنہ اُمت کے پاس عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے جس کے مطابق رسول اللہ کے عہد سے نسلاً بعد نسلٍ وہ عمل کرتی چلی آتی ہے۔ اس لیے یہ یقینی اور دینی ہے۔ اسکی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے"

دوسری جگہ مؤلف نے لکھا ہے:۔

"غیر یقینی شے کا دین میں کچھ دخل نہیں"

ان عبارات اور مؤلف کی ان تصریحات سے جو اوپر بیان ہو چکی ہیں، ان کا مسلک واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ:۔

(۱) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور وہ قوانین جو آپ نے سیاسی، جنگی، اور تمدنی و اجتماعی امور میں امیر قوم کی حیثیت سے نافذ کیے تھے، اس اسوۂ رسول کی حدود سے خارج ہیں جس کی پیروی کا حکم عام قرآن میں دیا گیا ہے۔ لہٰذا انکی تو اب ضرورت ہی نہیں رہی، کیونکہ امارت کے فرائض ہنگامی ہیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔

(۲) صرف ان امور میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عمل (نہ کہ قول) قابل تقلید ہے جو عبادات اور دینی عمل سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن میں آنحضرت صلعم نے قرآنی احکام پر عملدرآمد کرنے کی صورت خود اپنے عمل سے بتا دی ہے۔

(۳) مولف کے نزدیک صرف وہ عمل متواتر ملیقینی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے اب تک جاری ہے، اور جس کی پیروی ہر نسل اپنے سے پہلی نسل کو دیکھ کر کرتی رہی ہے۔ رہیں وہ روایات جو آنحضرت صلعم کے اقوال و اعمال کے متعلق احادیث میں وارد ہوئی ہیں، تو وہ یقینی نہیں ہیں، اور دین میں ان کا کچھ دخل نہیں۔

ان میں سے پہلی دونوں باتوں کے متعلق میں قطعیت کے ساتھ کہتا ہوں، کہ قرآن کے بالکل خلاف ہیں قرآن میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے محض دینی اعمال دائماً قابل تقلید ہیں، اور تمدنی و اجتماعی امور میں آپ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین صرف اس عہد کے لیے مخصوص ہیں جس عہد میں وہ نافذ کیے گئے تھے۔ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں ہو جس سے، ان دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جا سکتا ہو اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیئے جا سکتے ہوں تو اسکو پیش کیا جائے۔ مجھ کو تو قرآن میں یہ حکم ملتا ہے

وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی اللہ و	کسی مومن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور
رسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم و	اس کا رسول کسی امر میں فیصلہ کر دے، تو ان کو اپنے معاملہ
من یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً	میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے۔ اور جو کوئی
(۳۳ ، ۵)	اللہ اور اسکے رسول کی نافرمانی کریگا وہ اتنی بھاری بہت بھٹک جائیگا

اس آیت میں زمانہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ مومن اور مومنہ سے خاص عہد رسالت کے مومن مرد و عورت مراد نہیں لیئے جا سکتے۔ اَمْراً کا لفظ نہایت عام ہے جو ہر قسم کے معاملات پر حاوی ہے، خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی۔ اللہ اور رسول سے مراد اللہ اور رسول ہی ہیں " ہرگز نہیں ہے کیونکہ امیر یا اولی الامر بہرحال مومن ہی ہونگے اور یہاں تمام مومنین و مومنات سے یہ حق سلب کیا گیا ہے کہ خدا اور رسول نے جس معاملہ کا فیصلہ کر دیا ہو اس میں انہیں مجتمعاً یا منفرداً خود فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار باقی رہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ جو امر کے خلاف عمل کرے گا وہ صریحاً

بہت دور بھٹک جائیگا»، یہ اشارہ ہی اس طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اور اسکی ہدایت سے اسکے رسول نے اپنے احکام اور اپنے قوانین سے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کر دیا ہے، اس نظام کا قیام منحصر ہی اس پر ہے کہ جو احکام جاری کر دیئے گئے ہیں اور جو قوانین نافذ کر دیئے گئے ہیں انکی ٹھیک ٹھیک پیروی کی جائے۔ اگر خدا اور اس کے رسول کی قولی اور عملی رہنمائی سے قطع نظر کر کے لوگ خود اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کچھ طریقے اختیار کریں گے تو یہ نظام باقی نہ رہے گا، اور اس نظام کے ٹوٹتے ہی تم راہ راست سے بھٹک کر بہت دور نکل جاؤ گے۔ تعجب ہے، کہ جب قرآن میں ایسی صاف اور صریح ہدایت موجود ہو اسکی تعلیمات لکھنے والے نے وہ مسلک اختیار کیا ہے جو آپ ابھی سن آئے ہیں۔

رہی تیسری بات، تو اس کے متعلق میں اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ «ترجمان القرآن» کی گزشتہ اشاعتوں میں عرض کر چکا ہوں، ان کے دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ میں جناب مولف سے صرف یہ سوال کروں گا کہ اگر کوئی شخص ان تمام بدعات و خرافات کو جو آج مسلمانوں کی مذہبی زندگی میں رائج ہو گئی ہیں، وہ یقینی عمل متواتر قرار دے جو رسول اللہ ؐ کے عہد سے نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہے، اور اس بنا پر انہیں داخل دین سمجھے تو آپ کے پاس کونسا ایسا یقینی ذریعہ ہے جس سے آپ یہ فیصلہ کر سکیں کہ یہ عمل رسول اللہ ؐ کا نہیں ہے بلکہ بعد کے لوگوں کی ایجاد ہے؟ آپ فرمائیں گے کہ ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کریں گے اور اسکی آیات سے ان بدعات کی تردید کریں گے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اول تو رسول اللہ ؐ کے قول و عمل سے آیات قرآنی کے معانی کی جو تعیین ہوتی ہے اسکو نظر انداز کر دینے کے بعد آیات کی تاویل میں ایک بدعت پسند انسان اتنی گنجائش نکال سکتا ہے کہ آپکی بہت سی بدعتوں کی تردید مشکل ہو جائیگی۔ دوسرے اگر آپ نے قرآن ہی سے انکی بدعات کی تردید کر بھی دی تو یہ اس کے اس دعوے کی تردید نہ ہوگی کہ یہ وہی یقینی عمل متواتر ہے جو رسول اللہ ؐ کے عہد سے نسلاً بعد نسل چلا آ رہا ہے۔ آپ اپنے مسلک کے مطابق اس عمل متواتر کو غیر یقینی کہہ نہیں سکتے۔ اور آپ تاریخ سے بھی (جو روایات کی طرح غیر یقینی ہی ہونی چاہیئے) یہ استدلال نہیں کر سکتے کہ یہ بدعات عہد رسالت میں نہ تھیں بلکہ فلاں عہد میں جاری ہوئیں۔ اب صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ آپ ان کو یقینی مان لیں اور اس صورت میں احکام قرآنی اور عمل رسول کے درمیان اختلاف اور رسول اللہ کی رسالت میں طعن لازم آتا ہے۔

اس کے علاوہ مولف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور عالم برزخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی

(باقی مضمون صفحہ ۹ پر ملاحظہ ہو)

مطبوعات

بشائر النبیین لظہور خاتم الانبیاء والمرسلین | از مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔

بشارات کے باب میں، اردو میں، بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن علم، فرسودہ و پامال مباحث میں بھی نئی شان پیدا کر دیتا ہے۔ بشائر النبیین ایسا ہی رسالہ ہے۔ فاضل مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی نسبت انبیاء علیہم السلام کی بشارات، توراۃ و انجیل سے بلفظہا اقتباس کی ہیں، اور بذیل آیہ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ ان کی تفسیر کی ہے، اور آیات کلام اللہ و احادیث و آثار سے اس توضیح و انطباق کو مؤثق کیا ہے۔

کلمۃ اللہ فی حیات روح اللہ | از مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی۔ ضخامت ۷۵ صفحات

قرآن عزیز نے مسیح علیہ السلام کے قتل و صلب کی بشدت نفی کی ہے، اور بجسد عنصری ان کا آسمان کی طرف اٹھایا جانا اور زمین پر واپس آنے تک اپنے خدا کے حضور میں رہنا، نصوص سے ثابت ہے اور سلف و خلف کا اس پر اجماع ہے۔

(بقیہ صفحہ ۸۷) بہت سی غلطیاں ہیں، اور بعد میں مولف نے جو ترمیم اپنی کتاب میں کی ہے اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنی پچھلی رائے سے رجوع کر لیا ہے۔ لیکن یہاں میں ان غلطیوں سے بحث کرنا اس لیے مناسب نہیں سمجھتا کہ ان پر "معارف" کے صفحات میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ اگرچہ اس طریق بحث سے مجھے اتفاق نہیں ہے جو وہاں اختیار کیا گیا ہے، لیکن ان دلائل سے مجھ کو پورا اتفاق ہے جو "معارف" کے فاضل مضمون نگاروں نے مولف کے مقابلہ میں پیش کیے ہیں۔

لیکن دورِ حاضر کی "روشن خیالی" نے جہاں بہت سے عقائد میں قطع و برید کی ہے، حیاتِ مسیح کے اس مسلم مسئلہ کو بھی متنازع فیہ بنادیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ قادیانی جماعت نے مرگِ مسیح کے اعتقاد کو بڑی قوت کے ساتھ پھیلانے کی کوشش کی ہے، جس کے وجوہ اس سے زیادہ ظاہر ہیں کہ ان کو ظاہر کرنے کی ضرورت ہو۔ فاضل محترم مولانا محمد ادریس دامت برکاتہم نے زیرِ نظر رسالے میں اسی مسئلہ پر کلام کیا ہے اور اس فاسد عقیدہ کی ایسے دلائل سے بیخ کنی کی ہے کہ معتقدین و مشتبہین کے لیے کسی پہلو سے انکار کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

اعجاز القرآن | از مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی ضخامت ۳۰ صفحات

اس مختصر رسالے میں مولانا موصوف نے کلام اللہ کے اعجاز پر دس براہین خود کلام اللہ ہی سے پیش کیے ہیں اور ان پر کلام کرکے قرآن کریم کا کلام ربانی و وحی رحمانی ہونا ثابت کیا ہے۔ جو حضرات اس باب میں مختصراً پڑھنا چاہیں ان کے لیے یہ رسالہ بنہایت شافی ہے۔

یہ تینوں رسالے ۱۲ار میں مل سکتے ہیں۔ جناب مؤلف سے عابد روڈ حیدرآباد دکن کے پتہ پر طلب فرمائیے

تاریخ الفقہ | از مولوی قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت دیدہ زیب قیمت ۱۲ار

ملنے کا پتہ :- دفتر اشاعت العلوم سرکار عالی شبلی گنج، حیدرآباد۔

قاضی صاحب ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں، اور صبر آزما حالات میں بھی ان کا قلم اپنی ملت کی ذہنی و اخلاقی ضیافت کا سامان کرنے سے نہیں رکتا۔ اس سے قبل بعنوانِ محمود و فردوسی، غازیانِ ہند، معجزاتِ اسلام وغیرہ رسائل لکھ چکے تھے جو نہایت پسند کیے گئے۔ اس مرتبہ تاریخ الفقہ پر قلم اٹھایا اور ایک مفید کتاب کا اردو میں اضافہ کردیا۔ موضوع کی وسعت کے لحاظ سے یہ کتاب اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن لائق مؤلف نے اس میں بہت سی کام کی باتیں جن سے اردو داں طبقہ عموماً بے خبر ہے، جمع کردی ہیں۔ قیاس و اجتہاد کی مشروعیت و حجیت پر بدلیل کتاب و سنت و آثارِ صحابہ مفصل کلام کیا ہے، صحابۂ کرام و تابعین باحسان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اختلاف کے وجوہ اور ایسے اختلافات کے سراسر رحمت ہونے پر گفتگو کی ہے، موضوع کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے قرن اولیٰ کے ائمہ مجتہدین کے تراجم احوال لکھے ہیں ... ثابت کیا ہے کہ تقلیدِ شخصی کا آغاز اسی عہد خیر و برکت میں ہوا جسے خیر القرون کہا گیا ہے پھر ان اسباب کی تشریح کی ہے جن کی بنا پر علمائے ربانیین نے ائمہ اربعہ ہی کی تقلیدِ شخصی پر اجماع کیا۔ آخر میں ائمہ سابقہ کے خوارق کا دیگر ادیان اسلام سے مقابلہ کرکے فقہِ اسلامی کی تفضیل ثابت کی ...

مکتبۂ علمیہ

ایک مکمل تجارتی کتب خانہ ہے جہاں سے ہر مذاق اور ہر علم و فن کی اردو عربی فارسی اور انگریزی کتابیں مل سکتی ہیں۔ طلبا، کے لیئے درسی کتابوں کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ بیرونی مقامات کے لوگوں کو بھی حسب فرمایش کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں۔

مکتبۂ علمیہ۔ چار مینار۔ حیدرآباد دکن

قواعد

رسالہ "ترجمان القرآن" بالعموم ہر ہجری مہینے کی ۲۰ تاریخ کو شائع ہوا کرے گا۔ مہینہ کے آخر تک جن حضرات کے پاس پرچہ نہ پہونچے وہ دوبارہ لکھ کر منگوا سکتے ہیں ختم ماہ کے بعد دوسرے مہینے کی ابتدا میں جن خریداروں کی شکایات موصول ہونگی ان کو پرچہ قیمتاً دیا جائے گا۔

جو حضرات اپنی جائے قیام کسی طویل مدت کے لیے تبدیل کریں انہیں اپنے جدید پتے کی اطلاع دفتر کو بھیج دینی چاہیئے ورنہ پرچہ نہ پہونچنے کی ذمہ داری دفتر پر نہ ہوگی۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرنے میں ہمیشہ نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے لیکن یہ لحاظ رہے کہ رجسٹر نمبر اور چیز ہے اور نمبر خریداری اور چیز۔

اشاعت کے لیئے مضامین اور حل طلب مسائل تمام ایڈیٹر کے نام سے بھیجے جائیں لیکن ایڈیٹر پر لازم نہیں ہے کہ ہر چیز شائع کرے۔

منیجر ترجمان القرآن ۔ خیرت آباد۔ حیدرآباد دکن)

(طابع و ناشر ابوالاعلیٰ مودودی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس چار مینار حیدرآباد دکن